نگارشات

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

(۱) حضرت علی علیہ السلام

نام، کنیت اور خاص امتیازات

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کتاب مدارج النبوت میں لکھتے ہیں:۔

علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نام اوست ابوالحسن و ابو تراب کنیت او ابن عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برادر او بمواخات وزوج فاطمہ بتول سیدۃ النساء وابو السبطین الحسن والحسین سیدی شباب اہل الجنہ دیوط اسم وی درجاہلیت و اسلام علی و گفتہ اندکہ نام کردہ بود اورا مادروی فاطمہ بنت اسد حیدر بنام پدرش اسد و حیدر، نام اسد است و چوں قدوم آورد ابو طالبؑ مکرہ پنداشت۔ ایں نام راپس تسمیہ کردبعلی۔

ولادت

گفتہ اندکہ بود ولادت وے در جوف کعبہ (مدارج النبوت) آپ کے خانہ کعبہ میں متولد ہونے کے متعلق شاہ ولی اللہ دہلوی نے تواتر کا دعویٰ کیا ہے۔

القاب

کثرت القاب کثرت فضائل کی دلیل ہے حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے القاب بہت کثرت سے تھے، یہاں تک کہ بعض وہ القاب جو کہ دوسروں سے مخصوص کردیئے گئے ہیں وہ دراصل آپ کی ذات سے متعلق تھے، چنانچہ شیخ عبدالحق نے لکھا ہے:۔

''تسمیہ کردہ است او را پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بصدیق کنانی الریاض النقرہ وتکنیہ کردہ است بابی الریحانتین و نیز لقب کردہ است بہ بیضۃ البلد و بامین وبشریف بہادی و بمہتدی و بذی الاذن الواعیۃ ویعوت الامت۔''

اکثریت فضائل

حضرت کے فضائل اس کثرت سے تھے، کہ اربابِ تصنیف ان کے استقصاء سے قاصر ہیں۔ دوسروں کے لئے انسان کو اوصاف تلاش کر کے لکھنا پڑتے ہیں۔لیکن آپ کے مناقب واوصاف کا یہ عالم تھا کہ صاحب قلم لکھتے لکھتے تھک جاتا ہے اور اقرار کرتا ہے کہ آپ کے اوصاف کو تام وکمال لکھنا دشوار ہے، ملاحظہ ہو علامہ ابن عبدالبر کی کتاب ''استیعاب فی معرفت الاصحاب'' مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآبادی جلد دوم ص ۴۷۸/

فضائلہ لا یحیط بہا کتاب وقد اکثر الناس من جمعہا فرائت الا خضار منہا الی النکت التی تحسن الذاکرہ بہا و تدل علی ما سواہا من اخلاقہٖ واحوالہ وسیرۃ۔ آپ کے فضائل کسی ایک کتاب میں نہیں آسکتے اورلوگوں نے انہیں بہت جمع کیا ہے اس لئے میں نے مختصر طور پر کچھ نکات کا تذکرہ کرنا مناسب سمجھا۔جس سے آپ کے اخلاقی حالات اور سیرۃ کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔علامہ

ابن ہجر مکی صواعق محرقہ ص۷۹ر میں لکھتے ہیں۔ ومنا قب علی وفضائله اکثر من ان مخفی حضرت علی کے مناقب اور فضائل حد احصاء سے باہر ہیں۔

پھر دوسرے لوگوں کے جو فضائل ہیں وہ سند واعتبار کے لحاظ سے امیر المومنینؑ کے فضائل کا ہم پلہ نہیں ہیں'' اس کا اعتراف متعدد اشخاص نے کیا ہے۔

استیعاب جلد ۲ ص ۴۷۹ر میں ہے کہ امام احمد بن حنبل اور قاضی اسمٰعیل بن اسحاق کا قول تھا: لم یروفی فضائل احد من الصحابة بالا سنا نید الحسان ماروی فی فضائل علی بن ابی طالب کسی صحابی کی شان میں عمدہ سندوں کے ساتھ وہ فضائل وارد نہیں ہوئے۔ جو حضرت علی ابن ابی طالب کی شان میں وارد ہوئے ہیں۔ علامہ ابن حجر نے مسخ مکیہ فی شرح المقصید ہ المز ۃ (مطبوعہ ص ۲۳۷ر میں علاوہ ان دو بزرگوں کے امام نسائی اور ابوعلی نیشاپوری سے بھی یہی قول نقل کیا ہے اور صواعق محرقہ ص ۷۲ر میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔

باوجود یکہ بنی امیہ نے کوئی دقیقہ آپ کے فضائل کے چھپانے میں اٹھا نہیں رکھا پھر بھی آپ کے فضائل ظاہر ہی ہوتے گئے۔ اس حقیقت کا علامہ ابن عبدالبر نے اعتراف کیا ہے، ان الفاظ میں: قد کان بنو امیة نیائون منه وبنقصونه فما زاداه الله ذالك الا سمعوا وعلوا وجة عنه العلماء بنی امیہ آپ کو ناشائستہ الفاظ سے یاد کیا کرتے تھے اور آپ کی تنقیص کیا کرتے تھے مگر خدا نے اس سے آپ کی بلندی وبرتری اور ہر دل عزیزی میں اوراضافہ کیا۔ (استیعاب جلد ۲ ص ۴۸۰ر)

انتہا یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی عداوت میں احکام شرح میں تبدیلیاں کر دی گئیں چنانچہ امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر جلد ا ص ۱۰۲ر میں بسم اللہ الرحمن الرحیم بلند آواز سے پڑھنے کی بحث میں لکھا ہے: ان علیا علیه السلام کان یبالغ فی الجهر فلما وصلت الدولة الی بنی امیة بالغوائے المبغے من الجهر سعیا فی الطالب آثار علی علیه السلام (حضرت علی علیہ السلام بسم اللہ کو بجہر پڑھنے کی بہت تاکید کرتے تھے۔ اس لئے جب بنی امیہ کو سلطنت پہنچی تو انہوں نے جہر کی ممانعت میں انتہائی کوشش کی، صرف اس لئے کہ علی بن ابی طالبؑ کے آثار محو ہوجائیں۔

اگر کوئی اور ہوتا تو سلطنت کی اس کدوکاوش جو اس کے خلاف جاری رہی اس کا دامن بہت حد تک مشکوک ہوجاتا، مگر یہ علی ابن ابی طالب کے اوصاف کی عظمت تھی جس پر ان کوششوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ معلوم ہوتا ہے یہ ایک خدائی انتظام تھا، جو حقانیت قائم رکھنے کے لئے خاص طور سے عمل میں آیا تھا۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(ماخوذ از شیعہ سلور جبلی نمبر لاہور ۱۳۷۲ھ صفحہ نمبر ۱۱۹ر)

(۲) حضرت علیؑ کی شخصیت

علم اور اعتقاد کی منزل میں

ایک چیز ہے علم، اس کا تعلق ان اوصاف سے ہوتا ہے جو کسی شخص میں پائے جاتے ہیں جیسے ایک حسین وجمیل شخص کا حسن و جمال ایک شجاع کے بہادرانہ کارنامے، ایک سخی کی فیاضی اور ایک عالم کے علمی فتوحات وغیرہ یا ان کے مقابل اوصاف اور نقائص، اور ایک دوسری چیز ہے اعتقاد۔ یہ ان مراتب اور مناصب سے متعلق ہوتا ہے جو کسی شخص کے لیے سمجھے اور مانے جاتے ہیں۔

عموماً ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص کے بارے میں اگر رائے اور اعتقاد میں اختلاف ہے تو اس کے صفات بھی معرض بحث بن جاتے ہیں اور اس کے اوصاف کو ایک علم ویقین کے انداز میں بیان کرتا ہے اور دوسرے نہ یہ کہ لاعلمی ظاہر کرتے ہیں بلکہ ان کا انکار کرتے اور ان کے خلاف علم کا ادعا رکھتے ہیں۔ مختلف فیہ شخصیتوں کے بارے میں اس کا ہر شخص ذاتی طور پر مشاہدہ

کرسکتا ہے۔ مثلاً ایک طرف ان کے علم کے تذکرے سنائے جارہے ہیں اور دوسرے ان کو جاہل محض قرار دیتے ہیں۔ ایک گروہ شجاعت کا حال بیان کرتا ہے اور دوسری جماعت بزدلی کے نمونے پیش کرتی ہے، ایک فیاضی کی داستانیں دہرارہا ہے اور دوسرے ان کے بخل کے شاکی ہیں، ایک عدالت کی مثالیں گنوارہا ہے اور دوسرے مظالم کی فہرست سنارہے ہیں۔۔۔ مگر ایسی بہت ہی غیر معمولی شخصیتیں ہوسکتی ہیں جن کے متعلق اعتقاد کی منزل میں اختلاف کے باوجود اوصاف کی منزل میں دنیا متفق نظر آتی ہو۔ ایسی سب سے پہلی مثالی شخصیت ہمیں پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملتی ہے۔ آپ کے بارے میں اعتقاد کے لحاظ سے اختلاف کا ہونا تو اس سے ظاہر ہے کہ دنیا دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے، ایک مومن اور دوسرے کافر۔ اور یہ ''کافر'' کی لفظ کا جو اسلام نے ان کے لیے محاورہ قائم کردیا ہے، یہ نہ کوئی گالی ہے اور نہ کوئی طنز، بلکہ یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے جسے وہ خود تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ کسی بھی بات کو لیجئے، ایک مانتا ہے اور ایک نہیں مانتا۔ تو جو مانتا ہے، وہ اس کی نسبت سے مومن ہے اور جو نہیں مانتا، وہ اس کی بہ نسبت کافر ہے، چنانچہ قرآنِ مجید میں ایمان کے ساتھ ساتھ کفر کو بھی متعلق کے اختلاف کے ساتھ اوصافِ مدح میں وارد کیا ہے اس طرح کہ:۔

فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَ یُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی۔

جو طاغوت، یعنی باطل کی طاقت سے کافر ہوا اور اللہ کے ساتھ مومن ہوا، اس نے اللہ کی رسی کو، جو مضبوط ہے، تھام لیا ہے۔

دوسری جگہ اہلِ ایمان کی زبانی مقابل جماعتوں کو مخاطب کرکے یہ اعلان ہے کہ کفرنابکم: ''ہم تمہاری باتوں کی بہ نسبت کافر ہیں''۔ بس اسی لفظ کو اسلام کی مقابل جماعتوں کے لیے صرف کیا گیا جس کے معنی کے لحاظ سے اگر خود ان سے پوچھا جائے تو وہ اسے کہنے کے لیے تیار ہوں گے کہ ہم اس پیغام کو نہیں مانتے یا ان کی رسالت تسلیم نہیں کرتے۔ بس لغوی طور پر یہی نہ ماننا کفر ہے اور یہی کافر کی لفظ قرآن نے ان کے لیے صرف کی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ جب پیغمبرؐ کے بارے میں اعتقاد کی منزل آئی تو اس وقت بھی دو گروہ تھے اور اب بھی دو گروہ ہیں، ایک ماننے والے اور دوسرے نہ ماننے والے یعنی مومن اور کافر، مگر یہ تفریق اعتقاد کی منزل میں ہوئی۔ لیکن آپ کے اوصافِ ذات کی منزل جس سے علم کا تعلق ہے، اس میں یہ تفریق قطعاً نہیں ہوئی، اس لیے جو کافر ہوئے، وہ بھی آپ کو صادق جانتے تھے اور امین کی حیثیت سے مانتے تھے۔ اس صادق اور امین کے جاننے میں رسالت کا ماننا اور نہ ماننا کوئی فرق پیدا نہ کرسکا، یہاں تک کہ امین اس وقت بھی جانتے تھے جب کہ آپ کی جان لینے کے درپے تھے اور اگر امین جانتے نہ ہوتے تو شبِ ہجرت تک ان کی امانتیں رسولؐ کے پاس کیوں رہتیں؟

بس یہی صورت ہمیں رسولؐ کے بعد کی اسلامی شخصیتوں میں بدرجۂ اتم ان ہی کے آغوش کے پروردہ حضرتِ علی ابن ابی طالبؑ میں نظر آتی ہے۔

آپ کے بارے میں جب اعتقاد کی منزل پر نظر ڈالتے ہیں تو اتنا عظیم اختلاف نظر آتا ہے جتنا کسی شخصیت کے بارے میں ملنا مشکل ہے، یعنی ایک طرف افراط کی حد ہے جہاں غلو کی منزل الوہیت کے اعتقاد تک پہنچی ہوئی ہے اور دوسری طرف تفریط کی وہ رفتار ہے جو خوارج کے عقیدے کی شکل میں موجود ہے، اور پھر درمیان میں افراط وتفریط کے مختلف مدارج ہیں جن میں وہ ایک نقطۂ اعتدال ہے جو حقیقتِ امر کے مطابق ہے اور بہ نص رسولؐ معیارِ فلاح ونجات ہے۔ یہ تو ہے اعتقاد کا عالم، مگر جب آپ کے بارے میں علم کی منزل آتی ہے یعنی آپ کے اوصاف کی بلندی تو اس میں ہمیں قطعاً کوئی اختلاف نظر نہیں آتا۔

کوئی آپ کو امام اور خلیفۂ بلافصل مانے، کوئی آپ کو سیدالاولیا مانے اور سلسلۂ بیعت وارادت کی آخری کڑی تسلیم

کرے، کوئی سلسلے کا چوتھا خلیفۃ المسلمین مانے یا کوئی آخر میں جا کر کچھ نہ مانے بلکہ معاذ اللہ! آپ سے برأت کو اپنے دین کا جزو بنالے آپ سے بڑھ کر کوئی شجاع و بہادر نہ تھا آپ سے بڑھ کر کوئی عابد وزاہد نہ تھا۔۔۔۔۔مگر یہ سب ہی مانتے ہیں کہ آپ سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا۔۔۔۔۔غرض انسانی صفاتِ کمال کا بے مثال مرقع ہونے میں کوئی انکار کیسا، شک وشبہ بھی نہیں کرتا، اس لیے خود آپ کے دور میں سلمان، ابوذر، مقداد اور عمار یاسر جو کہہ رہے ہیں، وہ تو کہہ ہی رہے ہیں، دوسری طرف خلیفۂ اول بھی حدیثِ رسولؐ سنا رہے ہیں کہ اَلنَّظْرُ اِلٰی وَجْہِ عَلِیٍّ عِبَادَۃ اور خلیفۂ دوم بھی اعتراف کر رہے ہیں کہ لَوْلَا عَلِیٌّ لَھَلَکَ عُمَرُ، اور ام المومنین عائشہ بھی فرما رہی ہیں کہ حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو طبقۂ خواتین میں سب سے زیادہ محبت اپنی بیٹی فاطمہ زہراؑ سے تھی اور مردوں میں سب سے زیادہ محبت ان کے شوہر علی ابنِ ابی طالبؑ سے تھی اور یہاں تک کہ امیر شام معاویہ نے بھی ضرار کی زبان سے حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے اوصاف ومحامد کا تذکرہ سن کر اپنے دربار میں اعتراف کیا کہ

رَحِمَ اللّٰہُ اَبَا الْحَسَنِ فَقَدْ کَانَ کَمَا وَصَفْتَ: ''بے شک ابوالحسن (حضرت علیؑ) ایسے ہی تھے جیسا تم نے بیان کیا''۔

یہ ہے اوصاف کی وہ عظمت جہاں دوست ودشمن اور مومن وکافر کی کوئی تفریق نہیں رہی اور اعتقاد کی منزل میں کتنا ہی اختلاف ہو، لیکن اس شخصیت کے بارے میں علم کی منزل میں سب یکساں نظر آتے ہیں۔

❁❁❁

(۳) اسلامی نظریۂ حکومت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَآلِہِ الطَّاھِرِیْنَ۔

تمہید

حکومت کی ضرورت

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ نوعِ انسان کے لیے حکومت کا وجود ضروری بھی ہے یا نہیں۔ اگر مطلق العنان کا تخیل انسان کے لیے صحیح ہے تو یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ حکومت کی مطلق ضرورت ہی نہیں، مگر انسان کا آزادیِ مطلق سے دوچار ہونا غیر ممکن ہے۔ یہ کہنا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور آزادی اس کا فطری حق ہے، بالکل بے معنی الفاظ کا مجموعہ ہے، جب تک اس کے ساتھ یہ قید نہ لگائی جائے کہ ''ناجائز قیود سے آزادی''۔

اگر انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہے تو اس کے لیے اجتماعی قیود کی پابندیاں ناگزیر ہیں، حالانکہ حیوانات میں بھی بعض میں اجتماعی زندگی کے آثار نظر آتے ہیں مگر انسان کو تو اس سے مفر ہی نہیں۔ ان ہی اجتماعی قیود کا نام ''دستور العمل اور قانون'' ہے اور اسی کی نافذ کرنے والی طاقت کا نام حکومت ہے۔

ممکن ہے کہ یہ خیال کیا جائے کہ اگر افراد خود احساسِ فرض رکھتے ہوں تو ان کے لیے حکومت کی ضرورت نہ ہوگی، مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس کے لیے صرف احساسِ فرض کافی نہیں ہے بلکہ ہر ایک کو صحیح نظام کی معرفت بھی ضروری ہے اور یہ بھی لازم ہے کہ ان سب کا نقطۂ نظر مفادِ اجتماعی میں ایک ہی نقطے تک پہنچے اور کوئی دانستہ یا نادانستہ دوسرے کے مفاد کو نقصان نہ پہنچائے، اور یہ اسی وقت ہو سکے گا جب وہ پوری جماعت فکر وارادہ وعمل، تمام منزلوں میں یکساں درجے پر غلطی سے بری یعنی معصوم ہو۔ ایک ایسی جماعت کا ایک جگہ پر فراہم ہونا خیالی دنیا میں ممکن ہے وجود رکھتا ہو مگر خارجی عالم میں وقوع سے بے گانہ ہے، اس لیے اس صورت پر بحث ہی کرنا بے کار ہے۔ جہاں تک کہ عام انسانوں کا تعلق ہے، کوئی بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا نظامِ اجتماعی، یہاں تک کہ ایک گھر کی آبادی جو معاشرتی زندگی کی سب سے پہلی منزل ہے، یہ بھی کچھ حدود وحقوق اور ان کی پابندی کے بغیر باقی نہیں رہ سکتی اور اس میں بھی ایک طاقت کی ضرورت

ہے جو سب کو ان حدود کا پابند بنائے، اسے آپ حاکم نہ کہیے، گھر کا بڑا کہہ لیجیے۔ مگر یہی چیز ایک بڑے دائرے میں پہنچ کر حکومت کہلاتی ہے جس کی نوعیت میں چاہے جتنا بھی اختلاف کیا جائے، مگر اس کی ضرورت میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

اقسامِ حکومت

ارسطو نے حکومت کی تین قسمیں قرار دی ہیں:

(۱) ایک شخص کی حکومت

(۲) تھوڑے محدود ومعین افراد کی حکومت

(۳) بہت سے افراد کی حکومت

اور یہ واقعہ ہے کہ اس وقت سے اب تک دو ہزار برس گزرنے کے باوجود دنیا طرح طرح کے تمدنی انقلابات کی تبدیلیوں کے باوجود ان تینوں قسموں کے دائرے سے باہر نہیں نکلی ہے، مگر جب ہم ان تینوں صورتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو کوئی بھی ان میں سے عقلی اصول پر درست ثابت نہیں ہوتی۔

(۱) ایک شخص کی حکومت: اس میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ایک شخص میں آخر امتیاز کون سا ہے کہ وہ حاکم ہوجائے اور باقی سب انسان اس کے محکوم ہوں۔ اس کے لیے قدیم زمانے میں سلاطین کی جانب سے یہ خیال پھیلایا گیا کہ حاکم پیدائشی طور پر دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ جیسے انسان حیوانوں میں ایک نوعِ ممتاز ہے، ویسے سلاطین کا طبقہ انسانوں میں فطری طور پر ایک نوعِ ممتاز ہوتا ہے مگر یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے۔ ان انقلابات کو دیکھنے کے بعد جن میں سلاطین معزول ہوگئے ہیں اور کبھی کبھی آخر میں مقید رہے ہیں بلکہ گدائی پر مجبور ہوگئے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایک غیر معمولی انسان ہونے کا تصور صرف اس تخیلِ عظمت کی پیداوار ہوتا ہے جو عوام کے دماغ و دل پر ان کی سلطنت کے دور میں مستولی ہوتی ہے اور اسی لیے جب وہ تخیل ختم ہوجاتا ہے تو وہ بالکل معمولی انسان معلوم ہونے لگتے ہیں اگر ان کا امتیاز کوئی پیدائشی حق ہوتا تو وہ کبھی سلب نہ ہوتا، نہ اس میں انقلاب ہوتا پھر جب ہم تاریخ کا تبصرہ مختلف سلاطین پر دیکھتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر بہت سے اوصاف میں عام انسانوں سے بھی پست تھے۔ چونکہ مورخ کا قلم اکثر اس تخیل سے خالی ہوتا ہے جو رعایا کے دل میں بادشاہ کی نسبت ہوتا ہے، اس لیے وہ صاف لکھ دیتا ہے کہ فلاں بادشاہ احمق تھا یا جاہل تھا، یا بے رحم تھا یا خودغرض تھا وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا سبب جو ایک شخص کے اقتدار کے جواز کا بتایا گیا ہے، وہ طاقت واقتدار ہے۔ اسی کو دوسرے لفظوں میں قہر وغلبہ کہا جاسکتا ہے۔ ہمیں قہر وغلبہ کا ذریعۂ حکومت ہونا تسلیم ہے مگر معیارِ حقانیت ہونا کسی طرح تسلیم نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے حکومت قائم ہوجاتی ہے، بالکل ٹھیک! مگر قائم ہونا چاہیے بھی، ایسا نہیں ہے۔ بہت سی باتیں ہوجایا کرتی ہیں، مگر ان کا ہوجانا صحت و جواز کا ثبوت نہیں ہوسکتا۔ مثال کے طور پر ایک گھر کا دروازہ کھلا رہ گیا اور گھر والے بے خبر سو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ضرور ہے کہ چور آئیں اور سب مال لے جائیں، مگر ان کا یہ مال و اسباب لے جانا جائز بھی ہو، یعنی وہ مجرم قرار نہ پائیں، ایسا نہیں۔ اسی طرح اگر ڈاکو مسلح ہوکر حملہ کریں اور گھر کے رہنے والے یا تو اسلحہ رکھتے نہ ہوں یا تعداد میں کم ہوں تو کوئی شک نہیں کہ وہ ڈاکو جبر وطاقت سے ان کے مکان یا اسباب پر قبضہ کرلیں گے، مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مال واسباب یا جائداد ان کی ملک بھی ہوجائے، بلکہ دنیا کا ہر قانون ان ڈاکوؤں کو سزا دینے اور ان سے اس مال کے برآمد کرنے کے لیے تیار ہوگا۔ پھر اگر ایک مکان پر قہر وغلبہ ملکیت قائم نہیں کرسکتا تو ایک ملک یا قوم پر یہ قہر وغلبہ تسلط کو جائز کیونکر قرار دے سکتا ہے؟ پھر اگر طاقت ہی سے کسی فرد نے حکومت قائم کی تو اگر رعایا طاقت حاصل کر کے اس کی مخالفت کرے تو اسے کیونکر جرم سمجھا جاسکتا ہے؟

اب اس کے بعد ایک انسان کے اقتدار اور حکومت کے لیے دوسرے انسانوں پر کوئی وجہِ جواز باقی نہیں رہتی۔

(۲) تھوڑے محدود ومعین افراد کی حکومت: اس کے بارے

میں بھی وہی سوال ہے، یعنی ان چند آدمیوں کو حقِ حکومت کیونکر حاصل ہوا اور جس طرح ایک شخص کی حکومت کے لیے کوئی دلیل نہیں مل سکتی، اس طرح یہ چند آدمیوں کی حکومت بھی بلا وجہ ہے۔

(۳) بہت سے افراد کی حکومت: اس کے بارے میں سوال یہ ہے کہ یہ بہت سے آدمی تمام قوم کا جزو ہیں یا کل قوم ہیں۔ اگر جزو ہیں تو پھر وہی بات بحث طلب ہے کہ ان بہت سے آدمیوں کو ماباقی افراد پر حکومت کا حق کیا ہے اور اگر یہ کل قوم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خود پوری قوم حاکم ہے اور خود ہی محکوم۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مفادِ حکومت ختم۔۔۔۔حکومت کی ضرورت تو اس لیے تھی کہ ان افراد میں جو خود غرض، مطلب پرست اور کوتاہ نظر ہیں، کوئی طاقت ایسی ہو جو سب کو صحیح قانون کا پابند بنائے۔ لیکن جب قانون سازی خود اس جماعت کا کام ہوگیا تو یہ اپنے مطلب کے مطابق جیسا، جس وقت چاہے گی، ویسا قانون بنائے گی، چاہے وہ صحیح ہو، چاہے غلط۔ اور اس کے نتیجے میں مختلف جماعتوں اور مختلف افراد میں رسا کشی ہوتی رہے گی، یعنی ہر ایک چاہے گا کہ اپنے مطلب کی باتوں کو تمام جامعہ کے سر منڈھ دے اور اس کو ہر ایسے موقع پر بدل دینے کی کوشش کرے جبکہ اس کے مقصد کو نقصان پہنچاتا ہو۔ پھر اگر یہ سمجھا جائے کہ یہ تمام جماعت کسی ایک یا چند افراد کو دستور سازی کے لیے خود مقرر کرے تو جب کہ وہ افراد ان ہی عوام کے منتخب کیے ہوئے ہیں تو ان ہی عوام کی مرضی پر چلنا ضروری ہوگا، یعنی انھیں یہ لحاظ نہ ہوگا کہ صحیح و مناسب کیا ہے، بلکہ یہ دیکھیں گے کہ عام افراد چاہتے کیا ہیں اور اگر کبھی بھی انھوں نے رائے عامہ کی مخالفت کی تو یہ دوسری بار کے انتخاب میں ان کے ہاتھ سے اختیارات لے لیے جائیں گے اور دوسروں کے سپرد کیے جائیں گے۔

پھر ایک بحث یہ بھی ہے کہ رائے عامہ کے معلوم کرنے کا ذریعہ کیا ہے۔ ووٹ یعنی انتخابی رائیں، مگر یاد رہے کہ عوام اپنے شعور سے کام لینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ بے سوچے سمجھے خواص کے ہاتھ میں ہوجاتے ہیں اور جو خواص چاہتے ہیں، وہ ان سے کرا لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جسے سمجھا جاتا ہے اکثریت کا فیصلہ، وہ حقیقت میں چند افراد کی رائے ہوتی ہے جسے وہ مختلف صورتوں سے افرادِ قوم پر مسلط کرتے ہیں اور ان کے احساسات کو بے ہوشی سنگھا دیتے ہیں یہ سمجھا کر کہ یہ آپ کی رائے سے ہو رہا ہے۔ اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ جمہوری انتخابات میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ایک وقت میں وہی شخص اکثریت کا قبلۂ عقیدت ہوتا ہے اور دوسرے وقت وہی مخذول و منکوب ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص اپنے خصوصیات و اوصاف کے اعتبار سے بدلتا نہیں ہے مگر عوام کے رجحانات بدلتے ہیں اور اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عوام کا رجحان بھی صحت کا ذمے دار نہیں ہے۔

حقیقتِ امر یہ ہے کہ جمہوری نظام سے حاصل شدہ اقتدار بھی ایک شخص یا چند اشخاص کو ایک طرح کے قہر و غلبہ ہی سے حاصل ہوتا ہے، یہ اور بات ہے کہ کوئی غلبہ فولادی ہتھیاروں سے حاصل کیا جاتا ہے اور کوئی غلبہ ایسے ہتھیاروں سے جو دماغ کو متاثر کر دیں۔ کوئی شکنجہ ایسا ہو جس سے جسم کے مقید ہونے کا اندیشہ ہو اور کوئی شکنجہ ایسا ہو جو آزادیِ خیالات کو محصور کر دے، نتیجہ دونوں کا ایک ہے اور صحت و حقیقت سے دونوں دور ہیں۔

معاهدۂ عمرانی اور اس پر بحث

ایک نظریہ جسے ''معاہدۂ عمرانی'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کہ تمام قوم کی حکومت تمام قوم پر ہے، اس طرح کہ فرد اپنے اختیار سے اپنی ذاتی آزادی اور مطلق العنانی کو قربان کر دے مفادِ اجتماعی کی خاطر، اس طرح یہ پابندی اس کے لیے بارِ خاطر نہ ہوگی، کیونکہ وہ خود اپنے ہاتھ سے بخوشی اپنے ہی اجتماعی مفاد کے لیے اختیار کی گئی ہے۔ مگر اس میں سوال یہ ہے کہ جس طرح ابتدا میں یہ معاہدہ دل کی خوشی ہے اور اسی لیے وہ حقِ آزادی کے خلاف نہیں، اسی طرح کیا بعد میں اس معاہدے پر باقی رہنا امرِ اختیاری ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قانون کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی یا مخالفت جرم نہ ہو جبکہ وہ شخص جس نے معاہدہ کیا تھا، خود ہی اس معاہدے کو شکستہ کر دینا چاہتا ہے۔ اور اگر خلاف

ورزی جرم ہے اور اس کے بعد معاہدے پر برقرار رہنا ضروری ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آزادی افراد کی ہمیشہ کے لیے سلب ہوگئی، حالانکہ اس نظریے کی بنیاد بقائے آزادی پر ہے۔

پھر یہ کہ جب افرادِ جامعہ خودغرض اور مطلب پرست ہوں تو انھیں اس کا پابند کیسے کیا جا سکتا ہے کہ وہ قانون کی تشکیل میں اپنے مفادِ شخصی کو پیشِ نظر نہ رکھیں اور صرف مفادِ اجتماعی پر نظر ڈالیں۔ اس کی کوئی ضمانت نہیں ہوسکتی اور بغیر اس کے جو قانون بنے، وہ مفادِ عمومی کا پورے طور پر نگہبان نہیں ہوسکتا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اب تک دنیا نے جتنی بھی حکومت کی شکلیں تجویز کیں، ان میں سے کوئی بھی مستحکم بنیاد پر قائم نہیں ہے۔

اسلامی حکومتیں

اب اس کے بعد یہ سوال آتا ہے کہ پھر آخر اسلام کا نظریۂ حکومت کیا ہے؟ یہاں بعض اوقات یہ دھوکا ہوتا ہے کہ اسلام کا نظریۂ حکومت، یعنی مسلمانوں نے جو حکومتیں قائم کیں، ان کا نظام، مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ دونوں بالکل الگ چیزیں ہیں۔ مسلمانوں نے جو حکومتیں قائم کیں، ان کے متعلق بالکل غلط طور پر یہ مشہور ہے کہ وہ جمہوری اصول پر تھیں، مگر یہ بالکل غلط ہے۔ ان تمام حکومتوں میں شخصی فرماں روائی تھی جس کا اصول بھی ایک نہ تھا، بلکہ ایک جلسے میں حاکم کا انتخاب ہوا اور کبھی سابق کے حاکم نے اپنے بعد والے کو نامزد کر دیا اور کبھی اس نے ایک کمیٹی مشورے کے لیے بنادی اور کبھی ابھر کر صرف اقتدار قائم کرنا رہ گیا۔ جیسا ہوتا گیا، ویسے اصول بنتے گئے یعنی اجماع، استخلاف، شوریٰ قہر وغلبہ۔

اب مختصر طور پر ان چاروں اصولوں پر تبصرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اجماع:۔ اس سے مراد تمام رقبۂ مملکت کے افراد کا اتفاق سے یا صرف دارالسلطنت کے کل افراد کا اتفاق یا وہاں کی بھی ایک جماعت کا جو کسی خاص جگہ جمع ہوگئی ہو یا ان میں سے بھی بعض افراد کا جو متفق ہوگئے ہوں۔ اگر کل افرادِ حدودِ مملکت مراد ہیں تو ظاہر ہے کہ ان تمام افراد کی رائے کا معلوم ہونا اس زمانۂ برق و بخار میں، زمانۂ سیارہ وطیارہ میں بھی مہینوں کا کام ہے۔ چہ جائیکہ اس زمانے میں جبکہ یہ وسائلِ مخابرت نہ تھے، اس وقت میں یہ بات برسوں میں بھی حاصل ہونا مشکل تھی چہ جائیکہ اس سے کم، یعنی ایک دن کا تھوڑا سا حصہ۔ پھر عقلی طور پر وہ کتنے ہی کثیر افراد ہوں، ان میں سے سب کے فیصلے درست ہونا بھی ان پر موقوف ہے کہ اس میں کوئی ایک غیر جائز الخطا، یعنی معصوم مانا جائے اور اگر ایسا نہیں ہوا تو جس کل کا ہر جزو غلطی کی آماجگاہ ہو، وہ کل غلطی سے بری کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ اور اگر صرف دارالسلطنت کے کل افراد، تو انھیں حق کیا ہے کہ وہ مابقی اطرافِ مملکت کے افراد کی آزادی کو سلب کر کے کسی حکومت کو ان پر مسلط کردیں اس طرح کہ انھیں چوں و چرا کا کوئی حق نہیں، اور اس سب سے بڑھ کر یہ کہ دارالسلطنت میں سے بھی کچھ لوگ اور وہ بھی اس شدید کشمکش واختلاف کے ساتھ جس میں ہاتھا پائی تک کی نوبت آئے، پھر جب کہ یہ اجماع کسی اعلان کے ساتھ بھی نہ ہوا ہو اور اس کے لیے لوگوں کو سوچنے کا بھی موقع بالکل نہ دیا گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا فیصلہ نہ جمہوری سمجھا جاسکتا ہے، نہ عقلی طور پر جائز۔

اس کی صحت کے متعلق پیش کی جاتی ہے تو قرآن کی آیت اور پیغمبرؐ کی حدیث۔ آیت یہ ہے کہ وَمَن يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآئَتْ مَصِيْراً۔

(سورہ نساء آیت ۱۱۵ر)

اس میں صرف اتنے فقرے سے استدلال کیا جاتا ہے کہ ”جو شخص مومنین کے راستے کے خلاف اختیار کرے وہ جہنمی ہے“، مگر مومنین پر تو الف لام استغراق ہے جس کے معنی کل مومنین ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ تو نہیں نکلتا کہ جتنے بھی مومنین جس جگہ جمع ہو کر کوئی فیصلہ کرلیں، وہ صحیح ہوگا، پھر یہ پوری آیت کا مضمون ہے

بھی نہیں۔ پوری آیت تو یہ کہہ رہی ہے کہ جو شخص رسولؐ سے جھگڑا کرے اور مومنین کے خلاف طریقہ اختیار کرے، یہ جہنم میں جائے گا۔ اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رسولؐ سے جھگڑا کرنا خود مومنین کے خلاف ہے اور تقاضائے ایمانی کے منافی ہے۔ اس سے تو نتیجہ اور خلاف نکلتا ہے، یعنی یہ کہ پیغمبرؐ کے مقابلے کو رائے زنی کا حق نہیں ہے۔

حدیث یہ ہے کہ **لا تجتمع امتی علی ضلال (یا) علی خطاءٍ** یعنی پیغمبرؐ کا ارشاد ہے کہ ''میری امت کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہوسکتی یا غلطی پر متفق نہیں ہوسکتی''۔ اگر یہ حدیثیں سند کے اعتبار سے بالکل درست ہوں تب بھی اس میں تمام امت کے اجتماع کا ذکر ہے۔ چند افراد کا جمع ہونا اس میں ہرگز مذکور نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ اجماع جس معنی سے معیارِ حکومت قرار دیا گیا ہے، اس کی صحت پر کوئی دلیلِ عقلی یا نقلی نہیں ہے۔

استخلاف:۔ رہ گیا استخلاف، تو ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد ہے اس حکم اس کے حقِ حکومت پر جو دنیا سے جا رہا ہے اور جب کہ اسی کی حکومت کے جواز کا کوئی ثبوت نہیں تو استخلاف کا کیا حق اس سے قائم ہوگا؟

شوریٰ:۔ وہ ساختہ و پرداختہ اس حاکم کا ہے جو باستخلاف معین ہوا تھا اور جس کا خود حاکم ہونا ایک ایسے حاکم کی نامزدگی سے تھا جس کی حکومت خود اپنے محل پر ثابت نہیں ہے۔

قہر و غلبہ:۔ یہ وہی طاقتِ حق والا نظریہ ہے جس کو پہلے غلط ثابت کیا جا چکا ہے پھر اگر قہر و غلبہ ہی معیارِ صحت ہے تو اس میں اسلام کی بھی شرط بلا ضرورت ہے۔ اس کے بعد یہ کیوں نہیں سمجھا جاتا کہ اس میں تمام غیر اسلامی حکومتیں شرعی اور جائز حکومتیں ہیں؟ اس لیے کہ ان میں غلبہ و اقتدار حاصل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود مسلمان بھی تنہا غلبہ و اقتدار کو وجہِ سلطنت نہیں سمجھتے بلکہ اسلام کی شرط لگاتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کھلے ہوئے کافر سے اتنا شدید نقصان نہیں پہنچ سکتا جتنا دشنہ زیرِ آستین پنہاں کیے ہوئے کافر یعنی منافق سے۔

اسلام کا نظریۂ حکومت

اب دو بارہ پھر یہ بحث آتی ہے کہ خود اسلام کا نظریۂ حکومت کیا ہے۔ یہ پہلے بیان ہو چکا کہ حکومت کے دو کام ہیں: ایک دستور و قانون کی تشکیل، دوسرے طاقت و اقتدار کے ساتھ اس نظام کا اجرا و نفاذ۔

اب پہلے قانون کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے۔ اگر ''اسلام'' نام ہوتا صرف کچھ عقائد کا جو دماغ میں جگہ پالیں اور انھیں عمل سے تعلق نہ ہو یا کم از کم عمل سے تعلق ہوتا بھی تو صرف انفرادی زندگی میں اسے اجتماعیات سے بحث نہ ہوتی، تو بے شک یہ ہوسکتا تھا کہ مسلمانوں کو قانون کی تشکیل خود کرنے کی ضرورت ہو یا کسی دوسرے ملک کے قانون کی وہ پیروی کرلیں۔ لیکن اسلام تو خود ایک دستورِ حیات پیش کرتا ہے جس میں صرف عقائد نہیں، بلکہ زندگی کے لیے عملی قواعد و ضوابط ہیں اور وہ بھی صرف انفرادی زندگی سے متعلق نہیں، بلکہ ہماری اجتماعی زندگی سے متعلق ہیں۔ ایک مسلمان اسلام کو قبول کرنے کے ساتھ ہی یہ معاہدہ کر لیتا ہے کہ میں اپنی انفرادی و اجتماعی حیات میں اس ضابطہ و قانون کا پابند ہوں۔ اس کے بعد یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ عملی طور پر مسلم رہتے ہوئے پھر خود قانون سازی کرے یا کسی دوسرے شخص کے لیے قانون سازی کے حق کا قائل ہو یا پوری قوم مجتمع طور پر قانون سازی کے کام میں شریک ہو۔ یہ سب کچھ نہیں ہوسکتا، جب کہ وہ مسلم ہے اور اسلام کے ساتھ ہی وہ اپنے کو قانونِ اسلام کے سپرد کر چکا ہے۔

موجودہ زمانے کے بعض مفکرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قانون ساز کو اس جماعت سے خارج ہونا چاہیے جس کے لیے قانون بن رہا ہے تا کہ وہ قانون زیادہ سے زیادہ بے لوث اور غیر جانب دار ہو سکے، اس لیے زیادہ مناسب طریقہ یہ ہے کہ ایک ملک کے لیے قانون دوسرے ملک کے مدبرین سے بنوایا جائے، مگر یہ تو اس وقت صحیح ہے جب کہ قانون کا دائرہ شروع ہی سے ملک یا اقلیم کے لیے ہو۔ لیکن قانون ملکوں اور قوموں کی

تفریق سے بالاتر ہو، یعنی تمام نوعِ انسانی کے لیے ہو تو پھر مذکورہ اصول کے مطابق اس کے سوا کیا صحیح ہو سکتا ہے کہ قانون سازنوعِ انسانی کی جماعت سے خارج ایک بلند ذات ہو، یعنی خالقِ عالم جس کا علم و قدرت سب کو محیط ہے، یہی اسلام کا نظریۂ حکومت ہے۔ یہاں قانون ساز بھی اللہ ہے اور حاکم بھی صرف اللہ ہے۔ ایک مسلم اسلام کے ساتھ ہی اس کی اور صرف اس کی بادشاہت کو مان لیتا ہے جس کے بعد کسی فرد، کسی مجلس یا کسی قوم کا حکومت کرنا اللہ کے حق کا غصب کرنا ہے اور اس کے بعد ارسطو کی تینوں قسمیں حکومت کی ختم ہو جاتی ہیں۔ جب ایک حاکم حقیقی موجود ہے اور وہ اللہ ہے تو ایک فرد کی بھی حکومت غلط، چند آدمیوں کی بھی حکومت غلط اور بہت سوں کی بھی حکومت غلط۔

اس کا نتیجہ ہے آزادیِ کامل، یعنی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہیں رہتا یا یوں کہوں کہ کسی ایسی طاقت کا محکوم نہیں رہتا جس کا دباؤ فطرت کی قیود سے باہر ہے۔ رہ گیا خالق، اس کی اطاعت فطری طور پر بہر حال کرنا ہی ہے۔ اگر ارادی افعال میں بخوشی نہ کرے گا تو اضطراری اور فطری افعال میں بجبر کرے ہی گا۔ اسی لیے ارشاد ہوا: **لَهٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّكَرۡهًا**۔ (سورہ آل عمران آیت ۸۳/) مگر انسان کا شرفِ انسانی اس کا مقتضی ہے کہ وہ اس اطاعت کو اختیار کرے تا کہ اس کی حق شناسی کا ثبوت ملے بے شک چونکہ اس کے قانون کے معلوم کرنے کے لیے ہم الفاظ کے محتاج ہیں اور خالق کی ذات ایسی نہیں کہ وہ ہم تک پہنچ کر ہم سے بات کرے، اس لیے ایک واسطے کی ضرورت ہے۔ یہ رسولؐ ہے، مگر اس کا کام احکام الٰہی کا پہنچانا ہے۔ نہ اس کا ذاتی کوئی حکم ہے اور نہ اس کی ذاتی اطاعت ہے بلکہ جو اس کی زبان پر آتے ہیں، وہ احکام الٰہی ہیں (**وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰىؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰىۙ**)۔ (سورہ النجم آیت ۴۳/)

اور جو اس کی اطاعت ہے، وہ حقیقت میں اللہ کی اطاعت ہے (**وَمَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ**)۔

اب جب کہ حکومت اللہ کی ہے تو ہر دور میں اپنے نائب مقرر کرنا اسی کا کام ہے اور اس اختیار کو کسی وقت میں بھی اپنے ہاتھ میں لینا اللہ کے حقِ حکومت میں مزاحمت کرنا ہے جو ایک مسلم کے شایانِ شان نہیں ہے۔ قرآنِ مجید نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ **وَمَا كَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَّلَا مُؤۡمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اَمۡرًا اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهُمُ الۡخِيَرَةُ مِنۡ اَمۡرِهِمۡ**" (سورہ احزاب آیت ۳۶/) کسی مومن یا مومنہ کو اللہ اور رسولؐ کے فیصلے کے سامنے اپنے معاملات کے بارے میں کوئی اختیار نہیں رہتا۔ دوسری جگہ زیادہ واضح کلیے کی شکل میں اعلان کیا ہے کہ **وَرَبُّكَ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخۡتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الۡخِيَرَةُ** "(سورہ قصص آیت ۶۸/) پروردگار جو چاہتا ہے، پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے، منتخب کرتا ہے۔ انھیں انتخاب کا حق نہیں ہے"۔

اس کے علاوہ سنتِ الٰہیہ جو قرآن مجید کے تتبع سے ظاہر ہوتی ہے، وہ یہی ہے، یہاں تک کہ اس کی طرف کا حکمراں خود اپنے لیے اس کام میں مددگار بھی خود اپنی طرف سے مقرر نہیں کرتا بلکہ اللہ سے دعا کرتا ہے (**اَشۡرِكۡهُ فِىۡۤ اَمۡرِىۡ**)۔ اور محدود مقصد، یعنی دشمن کے مقابلے کے لیے ایک سردار بھی جو نبی یا رسول نہیں بلکہ "ملک" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ بھی قوم خود نہ مقرر کر سکی، بلکہ نبی سے خواہش کی **اِبۡعَثۡ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ** اور نبیؑ نے بھی خود نہ مقرر کیا، بلکہ یہ کہا کہ **اِنَّ اللّٰهَ قَدۡ بَعَثَ لَـكُمۡ طَالُوۡتَ مَلِكًا**: "اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے"۔ پھر قوم نے اس کے استحقاق پر اعتراض کیا۔ وہ اعتراض اور قوم کا حقِ مداخلت بھی قبول نہ کیا گیا، بلکہ اس ذیل میں ایک کلیے کا اعلان کر دیا گیا کہ **والله یوتی ملکه من یشاء**: "اللہ اپنے ملک کو جسے چاہتا ہے، دیتا ہے"۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ حاکمِ حقیقی اللہ ہے تو اللہ ہی نائب کو مقرر کر سکتا ہے اور یہی نائب انسانی جماعت میں ہمارا اصلی رہ نما بن سکتا ہے۔

مسلمانوں نے اس حاکم کے انتخاب کے حق کو اللہ سے

سلب کرکے اپنے ذمے لے کر بڑا نقصان اٹھایا۔ بایں معنی کہ اگر وہ اصول مقرر رہتا تو پھر من وتو کا سوال پیدا ہوکر انتشار پیدا کرتا۔ دیکھ لیجئے کہ رسولؐ کو اللہ کی طرف سے مان لیا گیا، پھر ایسا تو نہیں ہوا کہ مسلمانوں میں دو رسولؐ ہوجاتے۔ قبلے کو اللہ کی طرف سے مان لیا، پھر یہ نہیں ہوا کہ دو قبلے ہوجاتے اور کتاب کو اللہ کی جانب سے مانا، پھر یہ نہیں ہوا کہ دو قرآن ہوجاتے۔ اختلاف بس اسی وقت سے پیدا ہوا جب سے حاکم کے انتخاب کو اللہ کے بجائے خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بس اس کے بعد سے جو مسلمانوں کے شیرازے میں انتشار پیدا ہوا تو آج تک باقی ہے۔

پیغمبرؐ کا اعلان وعمل اس بارے میں متحد رہے کہ حاکم کے تقرر میں رعایا کا دخل نہیں۔ ایک عرب سردار نے جب اپنے اسلام لانے کی شرط یہ قرار دی کہ اپنے بعد حکومت میں میرا حصہ قرار دے دیجیے تو حضرتؐ نے جواب میں صاف فرمادیا، ''اس کا مجھے اختیار نہیں، یہ تو اللہ سے متعلق ہے''۔ اب جو حضرتؐ نے بیعتِ عشیرہ میں حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کے بارے میں اعلان کیا کہ یہ میرا وزیر، وصی اور خلیفہ ہے تو بحیثیتِ مسلمان یہ ماننا لازم ہے کہ یہ حضرتؐ کا اپنے ذاتی رجحان کی بناء پر اعلان نہیں ہے، بلکہ اللہ کی طرف سے اعلان ہے اور اس اعلان سے بھی یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ خود قوم کے اختیار سے متعلق نہیں ہے ورنہ رسولؐ اس کو اپنے ذمے نہ لیتے۔ اسی بنا پر غدیر کے خطبے میں پیغمبرؐ نے ولایتِ علیؑ کے اعلان سے قبل پہلے مسلمانوں سے اصول تسلیم کرالیا اس استفہام کے ساتھ کہا اَلَسْتُ اَوْلٰی بِکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ قَالُوا بَلٰی: ''کیا میں تم سب سے زیادہ اختیار نہیں رکھتا ہوں؟'' سب نے کہا۔'' بے شک آپ زیادہ اختیار رکھتے ہیں''۔ اب اس کو تسلیم کرنے کے بعد تو مسلمانوں کو اپنے خود مختاری کے حق کا حکومت کے بارے میں دعویٰ کبھی صحیح قرار ہی نہیں پاسکتا، اور اسی لیے رسولؐ کی زندگی میں یہ صدا کسی دہن سے بھی نکلتے نہیں سنائی دیتی کہ حکومت ہمارا حق ہے یا حاکم مقرر کرنا ہمارا کام ہے۔ ہاں! رسولؐ جب دنیا سے اٹھ گئے تو اب اجماع اور شوریٰ اور قہر وغلبہ کا نام سنائی دینے لگا، مگر یہ مسلمانوں کے خود ساختہ اصول ہیں، ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۶۰ھ تک حکومت کے یہ اصول جمہورِ مسلمین میں تسلیم کیے جاتے رہے اور عام نظریہ یہی قائم رہا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب ان تین طریقوں میں سے کسی ایک سے حاکم کا تعین ہوجائے تو کسی کو مخالفت کا حق نہیں، اور اگر کوئی مخالفت کرے اور حاکم اس کے خلاف تادیبی مہم جاری کرے تو حاکم کا فعل درست اور جو شخص اس کے خلاف ہو، وہ مجرم اور اگر اس سلسلے میں قتل ہوجائے تو گمراہی کے ساتھ ہلاک شدہ سمجھا جائے گا، شہید اسے نہیں کہا جاسکتا۔

یہی اب تک عمل درآمد رہا تھا جس کے شواہد تاریخ میں بہت ہیں۔ امیر شام معاویہ نے اپنے فرزند یزید کے لیے نہ صرف ان طریقوں میں سے کوئی ایک، بلکہ ان تمام طریقوں کو جمع کردیا۔ انھوں نے شام اور عراق کے علاوہ مکے اور مدینے میں خود جاکر جلسے کیے اور یزید کی بیعت لی۔ اس طرح جتنا بڑا اجماع یزید کی خلافت پر ہوا، ایسا اس سے پہلے کسی خلیفہ پر بھی نہ ہوا تھا۔ اس کے ساتھ استخلاف بھی تھا اور قہر وغلبہ بھی اس کا نتیجہ صاف ہے کہ کسی شخص کو مخالفت کا حق نہ ہونا چاہیے اور مخالفت کرے تو بادشاہ کو اس کے خلاف ہر کاروائی کا حق اور وہ اگر قتل ہوجائے تو کسی ہمدردی کا مستحق نہیں۔ مگر حسینؑ ابنِ علیؑ کا یہ کارنامہ تھا کہ آپ اٹھ کھڑے ہوئے اس بادشاہ کے مقابلے کے لیے اور پھر اپنے ساتھ بے گناہی اور مظلومیت کی طاقت کو ایسا زبردست بنادیا کہ دنیا حسینؑ کو مظلوم اور یزید کو ظالم ماننے پر مجبور ہوئی۔ حسینؑ اور ان کے ساتھ سب شہید تسلیم کیے گئے اور یزید ہمیشہ کے لیے مردود وملعون قرار دیا گیا اس طرح حسینؑ نے اس نظریۂ حکومت کا تختہ الٹ دیا جو اسلامی نظریے کے خلاف مسلمانوں میں غلط طور پر مان لیا گیا تھا۔

مسلمانوں کا نظریۂ حکومت مادی اسباب، یعنی عوام کے اتفاق برائے انتخاب یا حصولِ تاج وتخت کا محتاج ہے، مگر اسلامی

نظریہ حکومت ان اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ تمام دنیا انکار کر رہی ہو، مخالفت پر کمر بستہ ہو بلکہ قتل پر تیار ہو، گوشہ نشینی و کسمپرسی ہو، پیوند دار لباس اور فرش حصیر ہو، لیکن اگر وہ اسلامی قانون کا سب سے بڑا واقف اور سب سے بڑا عمل پیرا اور اس کے محافظ ہونے کا اہل ہے اور اللہ کی طرف سے اس منصب پر مقرر ہوا ہے تو وہ ''الٰہی حاکم ہے'' اور دنیا پر اس کی اطاعت فرض ہے اور جو حکومتِ الٰہیہ کے ماننے والے ہیں، وہ اسی کو اپنا حاکم تسلیم کرتے رہیں گے اور جو بھی دنیا کا حاکم اپنے مادی اقتدار کی بنا پر تسلط قائم کرے گا، اسے ہمیشہ غاصب سمجھیں گے، چاہے وہ حکمران ظاہری طور پر اپنے کو مسلمان بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس فرقے کا پیرو بتاتا ہو جس میں حکومتِ الٰہیہ کے نظام کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ حکومتِ الٰہیہ کا ایک پیرو کبھی کسی طاقت کا محکوم نہیں ہوسکتا، یعنی اگر حالات کی نامساعدت سے وہ کسی دوسرے نظامِ اقتدار کے شکنجے میں اسیر بھی ہوگا تو ہمیشہ اس پر نظر رکھے گا کہ اللہ کا حکم اس کی نسبت کیا ہے۔ اگر اس نے یہ محسوس کیا کہ ان حالات میں حفاظتِ جان و مال یا کسی بلند مقصد کے تحفظ کی خاطر حکم الٰہی یہی ہے کہ ہمیں خاموشی کے ساتھ قانونِ سلطنت پر عمل کرنا چاہیے تو وہ عمل کرے گا جسے دنیا سمجھے کہ وہ حکومتِ وقت کے احکام کی اطاعت ہے، مگر حقیقت میں اپنے حاکمِ اصلی اللہ کی اطاعت کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اتفاق سے نتیجہ اس کا حاکمِ وقت کے قانون کی پیروی کے مطابق ہوگیا ہے، لیکن اگر وہ اپنے حاکم اللہ کا یہ منشا دیکھ لے گا کہ ان حالات میں پیروی جائز نہیں ہے تو وہ جان دینا گوارا کرلے گا، گھر کا برباد ہونا قبول کرلے گا مگر جہاد کے لئے کھڑا ہوجائے گا۔

حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی دشواری

یہ تو حکومتِ الٰہیہ کی اصل حقیقت ہے جو ہر انسان کی انفرادی زندگی میں بھی کارفرما ہے، لیکن جہاں تک اس کے ظاہری اقتدار کا تعلق ہے، وہ افرادِ صالح کے وجود پر موقوف ہے، اور اگر صالح افراد اتنی تعداد میں نہ موجود ہوتے تو وہ نائبِ حکومت موجود ہوگا جسے خصوصیت کے ساتھ بذریعۂ پیغمبر نامزد کیا گیا اور پھر بھی دنیا اس کی حکومت کو تسلیم نہ کرے گی اور اسے گوشہ نشین ہوجانا پڑے گا اور یہ سلسلہ ۲۶۰ برس تک جاری رہے گا جو اس کے تجربے کے لیے کافی ہے کہ افرادِ صالح کا فقدان حکومتِ الٰہیہ کے ظاہری طور پر برسرِ اقتدار آنے میں مانع ہے، لہٰذا اگر اس کے بعد نائبِ خاص ہماری نگاہ سے اوجھل ہوجائے تو اس کا سبب افراد کی عدمِ صلاحیت ہی قرار پائے گی۔ یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ جب حکمراں نائب ہے تو حکومت کیسے قائم ہو۔ یقیناً اگر اس وقت افرادِ صالح پیدا ہوجائیں تو حاکمِ حقیقی کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنے نائب کو ہمارے سامنے ظاہر کردے، جب کہ ایسا نہیں ہے تو موجودہ حالات میں حکومتِ الٰہیہ کے برسرِ اقتدار آنے کی کوئی توقع نہیں ہے۔

یوں نظری حیثیت سے کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت یہ حق حکامِ شرع، یعنی علمائے دین کا ہے۔ مگر مادی رجحانات کی رو میں ہمیں یقین ہے کہ اگر اس طرح کی تشکیل کا ارادہ کیا جائے تو خود اس طبقے میں جو منصبِ حکومت کا اہل سمجھا جائے، بہت سے افراد برسرِ اقتدار آنے کی کوشش کریں گے جو شاید اس کے اہل نہ ہوں اور ان افراد کو گوشہ نشین رہنا پڑے گا جو اس کے واقعاً اہل قرار پاسکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نتیجے میں وہ حکومت بھی حکومتِ الٰہیہ نہ ہوگی چاہے وہ حکومت شرع کے نام سے قائم کی گئی ہو صرف اس لیے کہ افرادِ صالح ہمارے علم میں نایاب ہیں اور ہوں تو یقیناً گوشہ ہائے گمنامی میں ہیں جن کا تعارف بھی دنیا کو نہیں ہے۔ ایسی صورت میں یہ یقینی سمجھنا چاہیے کہ جو بھی حکومت قائم ہوگی، وہ ''غیر الٰہیہ'' ہی ہوگی، چاہے وہ غیروں کی ہو اور چاہے اپنوں کی ہو، لیکن حکومتِ الٰہیہ کے علاوہ کسی اقتدار کی تنظیم اور کسی ادارے سے غیر مشروط معاہدۂ تعاون یا بیعت کسی طرح جائز نہیں، جب کہ اللہ کے ساتھ یہ معاہدہ کیے ہوئے ہیں کہ ہمیں اس کے احکام پر عمل کرنا ہے تو کسی جماعت کے نظامِ عمل کو ہم غیر مقید طریقے پر کیسے قبول کرسکتے ہیں؟ جب کہ یہ ممکن ہے کہ اس

نظامِ عمل میں ایسی صورتیں پیدا ہوں کہ ہمیں حکومتِ الٰہیہ کے احکام کی تکمیل میں اس کی مخالفت لازم ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں ہر حکومت کے ساتھ امنِ عام کی خاطر تعاون کرنا لازم ہے مگر آزادرہ کر یعنی خود اپنے فرض کے احساس سے صحیح طریقۂ عمل کو معلوم کرکے، لیکن کسی جماعت کے طریقے کا پابند ہو کر عمل کرنا یہ حکومتِ الٰہیہ کی پابندی کے منافی اور ہمارے ائمۂ معصومین علیہم السلام کی سیرت کے خلاف ہے۔

(ماخوذ از کتاب ایمانی شہ پارے مرتبۂ قائم مہدی نقوی ساحرؔ لکھنوی، پاکستان)

❀❀❀

(۴) دعوت اتحاد یا تجدید بنائے افتراق

جناب صوفی نظیر احمد صاحب کشمیری جمہور امت کی ایک جانی پہچانی فرد ہیں آپ اکثر فراخ حوصلگی سے اتحاد اسلامی بلکہ اتحاد انسانی کے نعرے لگاتے رہتے ہیں مگر آپ کی قلمی تراوشیں اکثر بجائے اتحاد کے افتراق ہی کی بانی ہوتی ہیں خاص طور پر آپ کی نظر توجہ شیعہ فرقہ کی طرف مبذول رہتی ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ قبل 'دعوت' دہلی میں عزائے حسینؑ کے بارے میں آپ کے مسلسل مضمون سے شیعوں کے دل کافی مجروح ہو چکے ہیں۔ اب آپ نے ایک کتابچہ شائع فرمایا ہے۔

''تجدید و تعمیر ملت اسلامی کا واحد طریقہ عمل، جس کا مقصد مسلمانوں اور ان کی جماعتوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنا بتایا گیا ہے۔ چنانچہ ٹائیٹل کے بعد والے صفحہ پر ''زعمائے امت سے دین و وقت کا تقاضا'' کی سرخی کے تحت میں آپ نے کل ہند مسلم مشاورتی اجتماع لکھنؤ کے خطبۂ صدارت سے جو اقتباس درج کیا ہے اس کی ابتدائی سطریں یہ ہیں۔

دین کا سب سے بڑا تقاضا اور وقت کا سب بڑا مطالبہ ہے کہ مسلمانوں اور ان کی جماعتوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کیا جائے۔ یہ ایک بنیادی ضرورت ہے جس کے بغیر افراد یا جماعتیں کسی کی بھی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی۔

پورے اقتباس کے بعد خود آپ نے اپنی طرف سے چند سطریں لکھی ہیں جن میں تحریر کیا ہے کہ

''راقم کے اس کتابچے کے سارے مندرجات عالمگیر انداز میں امت کے اس احساس کو پورا کرنے کی طرف متعین ترین اور یقین بخش ترین ایک قدم ہے۔ وحدت دین وامت کو بحال کرنا اس دور کا وہ عالمگیر تقاضا ہے کہ زعمائے دین وملت کو اسے پورا کرنے کے سوائے کوئی بھی چارہ کار نہیں ہے۔

چونکہ ہر شخص جو مجھے جانتا ہوا سے غالباً یہ بھی معلوم ہے کہ میں اتحاد بین الفرق کے ساتھ کتنا شغف رکھتا ہوں اور اس میں عملی حیثیت سے حصہ لیتا رہا ہوں اس لئے اس سرمایہ کے ساتھ یہ رسالہ اگر اتفاقاً بھی مجھے ملتا تو میں شوق وذوق کے ساتھ اسے پڑھتا چہ جائیکہ مصنف نے شاید میرے اسی ذوق کے معلوم ہونے کی بنا پر اسے خصوصی طور پر میرے پاس روانہ فرمایا اور جن کے ذریعہ سے رسالہ پہنچا ان سے یہ معلوم ہوا کہ موصوف اس سلسلہ میں کوئی کانفرنس منعقد کرنا چاہتے ہیں اور اس کے بارے میں شاید تعاون حاصل کرنے کے لئے مجھ سے ملاقات بھی فرمائیں گے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ اس رسالہ کو میں نے اور بھی زیادہ شوق کے ساتھ پڑھا مگر اسے پڑھ کر انتہائی مایوسی ہوئی کہ وہ دعوت واتحاد کے نام سے پیش کیا گیا ہے مگر اس میں بجائے اتحاد کے افتراق وانشقاق کی تبلیغ کو وسیع کرنے کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔

چنانچہ دیباچہ کو جو صفحہ ۴و۵ پر ہے ختم کرکے اصل کتاب شروع کرتے ہیں۔ دو صفحوں کے بعد ایک دم آپ جس طرح فرقۂ شیعہ پر ابل پڑے ہیں وہ اس طرح ہے۔

امت کے شیعہ فرقے کے لئے یہ مرحلہ جذباتی طور پر زیادہ تکلیف دہ ہوگا اس لئے کہ وہاں دین نام ہی شخصیت پرستی کا رہ گیا ہے لیکن اس کا معاوضہ بھی سب سے زیادہ اسی کو ملے گا۔ محتشم کاشی اور انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں کے بجائے اسے قرآن

مجید ملے گا اور رونے رلانے والے ہیروز کے بجائے اسے خاتم الانبیاؐ کا ابد بقا اسوۂ حسنہ ملے گا جو اسے امت کے سب سے زیادہ غلو کرنے والے ایک شخصیت پرست فرقے کے بجائے تعمیر وملت ودین کا مقدمۃ الجیش بنا ڈالے گا۔

دعوت اتحاد کے اس اسلوب میں تفرقہ اندازی کا اتنا سامان موجود ہے جس پر پوری طرح اگر تبصرہ کیا جائے تو مناظرہ کا ایک بڑا معرکہ کارزار گرم ہو جائے۔

میں تو بس اصولی طور پر اتنا ہی اکتفا کروں گا کہ آپ کسی مذہب کے بنیادی اصول پر حملے کرکے یہ امید کیجئے کہ وہ اسے اتحاد کی مخلصانہ دعوت سمجھے بالکل غلط ہے۔

''آخر شیعوں کا دین شخصیت پرستی کیوں قرار دیا جارہا ہے۔''

کیا اس لئے کہ وہ امامت کو منصوص من اللہ مانتے ہیں اور اس میں اجتماع وشوریٰ کا دخل نہیں مانتے؟ اگر یہ شخصیت پرستی ہے تو پھر ساری امت مسلمہ کو شخصیت پرستی میں گرفتار کیوں نہ مانا جائے جبکہ وہ رسالت کو منصوص من اللہ مانتے ہیں اور اس میں اجتماع وشوریٰ کا دخل نہیں مانتے۔

جناب صوفی صاحب کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ دعوت اتحاد اور چیز ہے اور دعوت ارتداد اور چیز ہے۔

کیا سیکولر حکومت کی طرف سے کوئی اکثریتی طبقہ کی فرد اگر مسلمانوں کو یہ کہہ کر دعوت اتحاد دے کہ یہ مرحلہ آپ کے لئے جذباتی طور پر تکلیف دہ تو بہت ہوگا اس لئے کہ آپ نے اپنے دین وایمان کا مرکز حضرت محمد مصطفیؐ کو بنالیا ہے جو ملک عرب میں پیدا ہوئے تھے مگر اس کا معاوضہ بھی آپ ہی کو بہت بڑا ملے گا کہ ایک محدود شخصیت کے بجائے آپ وسیع انسانیت کے پرستار بن جائیں گے تو آپ اسے دعوت اتحاد سمجھیں گے یا دعوت انضمام وادغام؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ اکثریت واقلیت کے معاملات بھی کتنے نازک ہیں ایک اقلیت جس بات کو اپنے سے بالا دست اکثریت کی طرف سے ظلم سمجھتی ہے اسی کو وہ جب اپنے سے چھوٹی اقلیت کے ساتھ کرے تو اسے عین عدل سمجھ لیتی ہے۔ یہ ذہنیت چاہے کتنی ہی عام ہو مگر غلط یقینی ہے۔

''تمہیں محتشم کاشی اور انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں کے بجائے قرآن ملے گا۔''

کتنی تکلیف دہ اور دل آزار بات ہے۔ کاش صوفی صاحب اسے محسوس کرسکیں اس کے معنی یہ ہیں کہ تم ان مراثی کے گرویدہ ہوکر قرآن سے کوئی مطلب نہیں رکھتے۔ ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے یہ ایک بہت بڑی گالی نہیں تو کیا ہے؟ آپ کسی کو گالیاں بھی دیئے جائیں اور پھر فرمائیں کہ ہم تمہیں بلا رہے ہیں کہ تم ہم سے گلے مل جاؤ۔ یہ دعوت اتحاد دینا نہیں ہے، مفہوم اتحاد کا مذاق اڑانا ہے۔ پھر اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی کہ رونے رلانے والے ہیروز کے بجائے خاتم الانبیاؐء کا اسوۂ حسنہ ملے گا۔''

یہ ان ہیروز کی ایک طرح سے توہین ہونے کی بنا پر شدید طور سے دل آزار بھی ہے اور اس لحاظ سے بالکل غلط بھی کہ خاتم الانبیاؐ بھی صحیح معرفت رکھنے والوں کے نزدیک رونے رلانے والے ہی ہیرو ہیں لہٰذا رونے رلانے والے ہیروز کے چھوڑنے والے خاتم الانبیاؐ کے ابد بقاء اسوۂ حسنہ کی چھاؤں بھی نہیں پاسکتے۔

آگے چل کر صفحہ ۲۵ پر مستقل عنوان قائم کیا گیا ہے: ''امت کا سب سے پہلا مہلک اختلاف'' اور اس کے تحت میں لکھا ہے کہ

امت کا سب سے پہلا اختلاف جس نے امت کو، سارے عالم انسانی کو، دین وآئین واحد پر لانے کی صراط مستقیم سے ہٹا کر خالص اندرونی نوعیت کے باہمی جھگڑے میں مصروف کردیا وہ اختلاف ہے جسے شیعہ سنی اختلاف کہا جاتا ہے اور یہ اختلاف خالص سیاسی نوعیت کا تھا۔ خالص سیاسی اسباب رکھتا تھا۔ اور امت کے ''**امرھم شوریٰ بینہم**'' کے بجائے شخصیت کو اصول کی سی اہمیت دے کر اس کی طرف دعوت دینے پر مبنی تھا۔ اب اگر اس کا پورا جواب دیا جائے تو فریاد شروع ہو جائے گی کہ مناظرانہ بحثیں چھیڑ دی گئیں اور افتراق کی باتیں کی جارہی ہیں۔

حالانکہ مناظرہ اورافتراق کی بات کا آغاز خود کیا جارہا ہے۔

تفصیلی بحث میں جانے سے انتہائی پہلو بچانے پر بھی اظہار واقعہ کے لئے اتنا کہنا تو ناگزیر ہے کہ بلاشبہ ہم بھی امت کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا مہلک اختلاف اسی کو سمجھتے ہیں مگر اس کی ذمہ داری اس فریق پر ہے جس نے نفس خدا ورسول کو نظر انداز کر کے خود رائی کا علم بلند کیا اور **النبی اولی بالمومنین من انفسھم** اور **اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول** اور **ماکان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم** کو پس پشت ڈال کر بساط شوریٰ کو مخالفت خدا ورسولؐ کی زمین پر بچھایا۔ حالانکہ مذکورہ محکمات کے ہوتے ہوئے **امرھم شوری بینھم** کا دائرہ صرف انہیں امور میں محدود ہوسکتا ہے جہاں نفوس ربانی مقابلہ پر موجود نہ ہوں۔

شوریٰ کے دائرہ کی یہی وسعت اسلام کے نام سے ہر غیر اسلامی چیز کے رواج پانے کی باعث ہوگی جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور اس لئے افسوس ہے کہ جس چیز کو جناب صوفی صاحب تجدید وتعمیر ملت اسلامی کا واحد طریق عمل، سمجھ رہے ہیں وہی ہمارے نزدیک افسانہ وتخریب ملت اسلامی کا واحد سبب ہے۔

ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ اس نام سے جو علم بلند ہوگا اس کے پھر ہرے کے نیچے ہم اس وقت تک نہیں آسکتے جب تک کہ ہم اس بنیادی خصوصیت کو خیر باد نہ کہہ دیں جو ہماری ملی انفرادیت کی اصل علامت ہے اور یہی جناب صوفی صاحب کا مطلب ہے مگر جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس کو نقصان واتحاد کا نام دینا فریب دہی نہیں تو خود فریبی ہے جس کا حقانیت سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ والسلام

علی نقی النقوی

۲۰ رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ علی گڑھ

(ماخوذ از ہفتہ وار اخبار پیام اسلام، لکھنؤ، ۱۶؍فروری ۱۹۶۵ء/ ۱۳؍شوال ۱۳۸۴ھ ص ۱؍)

❀❀❀

(۵) مسلم پرسنل لا ناقابل تبدیل

ہندوستان میں جب سے ملکی حکومت برسر اقتدار آئی ہے، وقتاً فوقتاً اسلامی شریعت میں ترمیم کی تجویز سامنے آتی رہی اور ادھر چند سال سے اس میں قوت اور شدت پیدا ہوگئی ہے، جس میں مسلم ممالک میں بنام اصلاحات وترقیات نافذ شدہ ترمیمات کی نظیر پیش کی جاتی ہے۔ ضرورت کا احساس اور بعض حضرات کی فرمائش محرک ہورہی ہے کہ میں شیعی نقطۂ نظر کو اس سلسلہ میں پیش کردوں جو مختصراً درج ذیل ہے۔

ہمارے نزدیک جواز روئے قرآن وحدیث ثابت ہے اور عقل سلیم بھی اس پر مہر تصدیق ثبت کئے ہوئے ہے کہ قانون شریعت کا واضع خداوند عالم ہے۔ خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی واضع قانون کی حیثیت حاصل نہیں ہے، بلکہ آپ مبلغ قانون تھے۔ **ولقد جعلناك علی شریعۃ من الامر فاتبعھا ولا تتبع السبل فتفرق بکم عن سبیلہ۔**

اس طرح حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی متبع ہیں۔ معاذ اللہ متبوع نہیں ہیں (**ان اتبع الا مایوحی الیّ**) اور مسلمانوں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ رسولؐ کا اتباع کریں (قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ) اور رسولؐ کے اتباع کے معنی ہیں اس قانون کا اتباع جو ان کے ساتھ آیا ہے۔ (**فالذین اٰمنو ابہ وعزروہ ونصروہ واتبعوالنور الذی انزل معہ اولئك ھم المفلحون**) یہ نور جو آپ کے ساتھ آیا ہے ان ہی احکام کا ہے جو قانون شریعت کی صورت میں آپ کے ذریعہ سے نافذ ہیں اور جن کے ذریعہ سے سابقہ شریعتوں کو منسوخ کیا گیا ہے۔ (**یضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم**) اور یہ اتباع اس ایمان کا جو پہلے نمبر پر آیا ہے ایک عملی تقاضہ ہے اور اس اتباع کے خلاف راستہ اختیار کرنا اور اس قانون کے دفعات میں ترمیم کرنا رسول اللہ کے مقابلہ میں

مشاقہ ہے جسے غیر سبیل المومنین کہتے ہوئے اس پر وعید عذاب کیا گیا ہے۔(ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدیٰ ویتبع غیر سبیل المومنین نوله ما تولی ونصله جهنم وساءت مصیرا)

چوں کہ ایمان بالرسالہ کسی ایک دور سے مخصوص نہیں اس لئے شریعت رسول سے کسی دور میں بھی مسلمانوں کو انحراف جائز نہیں ہوسکتا (لن تجد لسنّة الله تبدیلا ولن تجد لسنة الله تحویلا)

بے شک پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے تبلیغ احکام بمقتضائے اسباب وظروف تدریجی طور پر ہوئی اس لئے کچھ احکام شرعی نصوص کے تحت مسلمانوں کو معلوم ہوئے اور کچھ جن کی تبلیغ کے مواقع آپ کے سامنے نہیں آئے، ان کے لئے منظور خالق یہ ہوا کہ وہ آپ کے نائبین خاص کے پاس مخزون ہوں جو اولی الامر ہیں تا کہ وہ بمقتضائے محل ان کی تبلیغ فرماتے رہیں اور اس لئے جب بحکم الٰہی (بلغ ما انزل الیك من ربك) اس سلسلہ کی پہلی کڑی کا اعلان ملاء عام میں اور اس طرح قیامت تک کی ہدایت کا سامان ہوگیا تو تکمیل دین کا بھی اعلان آگیا (الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا)

اس طرح ائمہ معصومین علیہم السلام نے بھی جو احکام شرع بیان کئے وہ بتوسط رسولؐ احکام الٰہی کی ترجمانی ہی کی حیثیت سے رکھتے تھے، نہ یہ کہ وہ معاذ اللہ خود احکام تراشتے اور قوانین بناتے تھے۔

پھر جب کہ نظام زندگی کے احکام وقوانین بنانے کا اختیار ہمارے نزدیک پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے معصوم نائبین علیہم السلام کو نہیں تو کسی جائز الخطا انسان کو وضع قوانین واحکام کا حق کس طرح ہوسکتا ہے۔

جو اس طرح کا حکم قرار دیا جائے گا وہ بدعت کا مصداق ہوگا جس کے لئے حدیث ہے کل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار۔ ہمارے نزدیک بدعت کسی نئے کام کو نہیں کہتے بلکہ شریعت میں کسی قسم کی ترمیم وتنسیخ ہی کو کہتے ہیں، خواہ بصورت اضافہ ہو، خواہ بصورت کمی اور خواہ تبدیلی۔

بے شک ہمارے نزدیک ''اجتہاد'' کا دروازہ کھلا ہوا ہے مگر اجتہاد کے معنی تحصیل حکم شرعی کی کوشش کے ہیں، نہ کہ تشکیل حکم شرعی کی کاوش۔ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ اگر چہ پیغمبر خدا صلی اللہ وآلہ وسلم اور ان کے نائبین کے ذریعہ سے زندگی کے مکمل قانون کی تبلیغ ہوگئی تھی مگر اس کے بعض جزئیات امتداد زمانہ سے ہم تک نہیں پہنچ سکے۔ اس طرح کثیر التعداد احکام تو نصوص سے ثابت ہیں مگر کچھ احکام کے بارے میں تلاش سے نصوص دست یاب نہیں ہوتے۔

جو احکام نصوص سے ثابت ہوجائیں، ان میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں، اس لئے ہمارا قطعی طور پر مسلمہ ہے کہ ''اجتہاد فی مقابلۃ النص'' حرام ہے۔

ہاں ان ادلہ شرعیہ کی دلالت میں اگر کوئی علمی پیچیدگی ہو جیسے بعض الفاظ مشترک ہوتے ہیں، ان میں معانی کی تعین قرائن سے ہوتی ہے یا الفاظ کے مجازی معنی پر محمول ہونے کا قرائن کی بناء پر امکان معلوم ہوتا ہو یا عمومات ہوں جن کی تخصیص کا احتمال ہو یا اطلاق ہو اور اس میں قیود ثابت ہونے کے کچھ وجوہ محسوس ہوتے ہوں تو ان میں معانی کی تعین کے لئے اجتہاد کی گنجائش ہے۔

بعض جگہ نصوص مختلف نظر آتے ہیں تو ان میں جمع یا ترجیح کے لئے اجتہاد ہوتا ہے یا وہ چیزیں جن میں نص ہم تک پہنچا نہیں تو ان قواعد شرعیہ یا اصول علیہ کو دیکھنا ہوتا ہے جو ازروئے شرع عمومی طور پر ثابت ہوئے ہیں اور اب سمجھنا ہوتا ہے کہ یہ محل ان میں سے کس قاعدہ یا اصل کے تحت میں داخل ہوتا ہے۔

یہ اجتہاد کی ضرورت ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ قائم رہے گی اور اس کا دروازہ بند نہیں ہوسکتا مگر جیسا کہ پہلے لکھا گیا اس کی حیثیت تحصیل حکم شرعی کی کوشش ہی تک محدود رہ سکتی ہے۔ کسی

نئے حکم کی تشکیل کا دروازہ وحی کے دروازہ کے بند ہونے کے ساتھ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے اور اس کا حق نہ کسی ایک مسلمان کو ہے اور نہ تمام مسلمانوں کو مل کر ہے اور نہ کسی بھی حکومت کو ہے خواہ وہ مسلمانوں کی حکومت ہو اور جو اس قسم کی بات کہیں بھی ہوئی ہو، خواہ وہ مسلم حکومتوں کی جانب سے ہو، وہ ہمارے نزدیک اسلام کے خلاف ہے۔ والسلام

(ماخوذ از پندرہ روزہ پیام اسلام لکھنؤ، ۲۱/اپریل ۱۹۸۹ء ۱۴/رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ صفحہ ۳ و ۴)

(۶) عراق کا محرم

میرے چند سال کے مشاہدات

محرم ۱۳۴۶ھ۔ نجف اشرف۔ دوران عشرہ میں جن مجالس میں شرکت ہوئی وہ حسب ذیل ہیں۔

۱- صبح سویرے علامہ سید ابوالقاسم طباطبائی کے مکان پر

موصوف بڑے قوی الحافظہ تھے۔ متعدد علوم کی کتابیں بہت سی آپ کو تقریباً تمام وکمال حفظ تھیں۔ اور جس محفل میں آپ بیٹھتے تھے برابر مصروف گفتگو رہتے تھے۔ اور عبارتیں کتابوں کی پڑھتے جاتے تھے چنانچہ آپ کی مجلس میں ذاکری کے قبل سامعین کو آپ کے بیانات سننا ہوتے تھے۔ زیادہ وقت اسی میں صرف ہوتا تھا اور پھر مختصر ذاکری کوئی روضہ خواں کر دیتا تھا۔

۲- سرکار میرزائے شیرازی کے مقبرہ کی مجلس ایک گھنٹہ بعد طلوع آفتاب۔

۳- مسجد حاجی یعنی حاج میرزا حسین مرزا خلیل کے مدرسہ سے متصل مسجد میں دو گھنٹے بعد طلوع۔

۴- مدرسہ وسطی آخوندؒ کی مجلس صبح بہت سویرے۔

۵- مدرسۂ حاجی کی مجلس یہ ایک گھنٹہ بعد طلوع۔

۶- آقا سید محمد خلخالی کے یہاں کی مجلس قبل طلوع آفتاب

۷- مدرسۂ قوام کی مجلس۔ ایک گھنٹہ بعد طلوع

۸- صحن اقدس روضۂ امیر المومنین علیہ السلام

۹- حسینیہ بوشہریان ۳ گھنٹے بعد طلوع

۱۰- مکان آغا سید حمید خوئی۔ ایک گھنٹہ بعد طلوع

۱۱- مدرسۂ قزوینی

یہ سب ظہر کے قبل کی مجلسیں ہیں۔ ان میں متعدد مجلسیں بیک وقت ہوتی ہیں جن میں ظاہر ہے کہ ہر روز ہر جگہ شرکت نہیں ہوسکتی بلکہ باری باری شرکت ہوتی رہی۔

۱۲- مدرسۂ صدر کی مجلس۔ عربی ۹ بجے یعنی ہمارے یہاں کے تقریباً ۳ بجے سہ پہر کو۔

۱۳- مدرسۂ آقا سید کاظم طباطبائی اعلی اللہ مقامہ کے متصل چھوٹی سی مسجد کے کوٹھے پر ہندوستانی طلاب کی مجلس بعد مغربین فوراً۔

۱۴- مدرسۂ بزرگ آخوند کی مجلس تقریباً ایک گھنٹہ بعد مغرب۔

۱۵- مدرسۂ شیخ مہدی کی مجلس ۲ گھنٹے بعد از غروب۔

۱۶- مولانا شیخ شمشاد حسین صاحب کے مکان پر بعد مغربین۔ یہ تمام شہر میں منعقد ہونے والے مجالس کا اقل قلیل حصہ ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ یہاں کے روزانہ مجلسوں کی تعداد سیکڑوں تک پہونچتی ہے مگر ان تمام مجالس میں دو مجلسیں کافی امتیازی حیثیت رکھتی ہیں لوسڑیان کی مجلس جس میں زیادہ تر ایرانی افاضل و تجار وغیرہ ہوتے ہیں یہ باعتبار گریۂ وبکا تمام شہر کی مجلسوں پر فوقیت کی حامل ہے اور دوسرے شب کو مدرسۂ بزرگ آقائے آخوند کی مجلس باعتبار اپنی متانت سنجیدگی اور شان وعظمت کے۔

عنوان ذاکری

مذکورہ بالا مجالس میں زیادہ تر فارسی میں ذاکری ہوتی ہے اور بعض مجالس میں عربی۔

مصائب میں دونوں زبانوں کی ذاکری میں اشعار لازمی جز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور عربی میں فصیح اشعار کے بعد مسجع یعنی سونی عربی میں جس کا سمجھنا بھی ہم کتابی آدمیوں کو دشوار ہوتا ہے مگر مجلس کی کامیابی باعتبار گریہ ان ہی اشعار میں ہوتی ہے

بیان عموماً سطحی ہوتا ہے۔ عرب ذاکرین احادیث اور کتب تواریخ کے عیون عبارات کو حفظ کئے ہوئے ہیں۔ انھیں کو موثر لہجہ میں سنا دیا کرتے ہیں۔ اکثر نہج البلاغہ کے خطبے اپنے اصلی الفاظ میں پیش ہوتے ہیں جن کے ساتھ تشریح وتبصرہ بہت ہی کم ہوتا ہے۔

ممتاز اهل منبر

اس سال جن ذاکرین کے سننے کا موقع ملا ان میں تین بزرگ امتیازی حیثیت رکھتے ہیں اور اپنے اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔

۱۔سید صالح حلی۔ یہ عرب ذاکرین میں سید الخطباء کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ستر برس یا کم وبیش عمر ہوگی مگر ابھی ان پر ضعف پیری نے اثر نہیں کیا ہے۔ ہاں بال داڑھی کے سب سفید ہیں۔ ان کا یہاں تقریباً ایک قرن سے طوطی بول رہا ہے۔ بے شک سرکار آقا سید کاظم طباطبائی اعلی اللہ مقامہ سے سیاسی وجوہ سے مخالفت کی بنا پر ایک طبقہ ان سے ناراض ہوا اور اب سرکار آقا سید ابوالحسن اصفہانی کی مخالفت کی بناء پر بہت سے خفا ہیں۔

پہلی محرم کو مدرسہ شیخ مہدی میں مجھے ان کا بیان سننے کو ملا اور اسی ایک بیان میں ان کی انفرادیت کا قائل ہوگیا۔ آج ممدوح نے حضرت سید الشہداؑ سلام اللہ علیہ کے مناسک حج اس خوبی سے بیان کئے تھے جو سننے سے تعلق رکھتے تھے۔ عنوان کلام یہ تھا کہ امام نے مکہ معظّمہ کے حج کو بروقت ترک فرمایا مگر اس کے بجائے ایک بڑے فریضۂ حج کی تیاری کردی حج کو ترک کرنا احرام کو کھولنا ہے جسے احلال کہتے ہیں۔ اور پھر حج کی تیاری کو احرام کہتے ہیں۔ موصوف کے ایک بسیط تقریر اس طرح کی کہ پہلے کہتے تھے **احل من حج کذا** اور پھر کہنے لگے **(احرم لحج کذا)** یعنی اس حج سے آپ نے احلال فرمایا جس میں یہ ہوتا ہے مثلاً عرفات میں وقوف اور اس حج کے لئے احرام باندھا جس میں یہ ہوتا ہے مثلاً کربلا کا قیام۔ پھر اس حج سے احلال فرمایا جس میں منیٰ کے میدان میں حیوانات کی قربانی کرنا تھی اور اس حج کے لئے احرام باندھا جس میں انسانی جانوں کی قربانی تھی۔ یوں ہی پوری مجلس اس تقابل میں ہوگئی کہ ایک فقرہ مجھے یادرہ گیا کہ **احل علیه السلام عن حج یستحب فیه اطعام حیات الحنطته للعقبان والغربان والحمائم وغیر ھا من طیورالحرم و احرم لحج اطعم فیه حیات القلوب لعقبان السیوف ونسور الریاح۔**

اس فقرہ کا لطف ترجمہ میں نہیں آسکتا۔ مجبوراً ترک کیا جاتا ہے۔

۲۔آقا شیخ محمد علی خراسانی ان کی عمر بھی ستر سال سے کم نہ ہوگی یوں ہی یہ حقیقی معنی میں واعظ ہیں یعنی پورا بیان موعظہ و نصیحت پر مشتمل ہوتا ہے جس میں اگر لب ولہجہ کی سختی اور انداز گفتگو کی تلخی نہ ہوتی تو اس کی افادیت زیادہ ہوجاتی۔

ان میں خاص بات یہ ہے کہ کبھی مجمع کے ماحول سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ جس قسم کی خرابیوں کے گرفتار مجمع میں زیادہ نظر آتے ہیں اسی کو موضوع بناتے ہیں۔ مصائب میں زیادہ تر علامہ آقا شیخ جعفر شوستری صاحب خصائص کے مضامین بیان کرتے ہیں اور اکثر ان کا نام بھی لے دیتے ہیں۔

۳۔آقا مرزا ہادی خراسانی۔ عمر تقریباً وہی ۷۰ سال۔ یہ یہاں کے بڑے وقیع اور مستند ذاکر ہیں۔ سنا ہے ایک زمانہ میں بڑے خوش آواز تھے مگر کسی پیشہ ور ہم عصر نے کوئی دوا کھلادی جس سے گلا بیٹھ گیا۔ اب آواز ایسی ہوگئی ہے جیسے کوئی دور کنویں میں بول رہے ہیں۔ بڑی مشکل سے سینہ سے آواز نکالتے ہیں جو بعض وقت بہت ہی ناخوش آئند کی طرح کی ہوتی ہے پھر یہ کہ اسے پورا مجمع سن بھی نہیں سکتا بلکہ منبر سے قریب کے لوگ اچھی طرح اور کچھ دور والے بزحمت سنتے ہیں مجمع کی آخری صفیں بالکل ہی نہیں سنتیں۔ کوئی اور ہوتا تو اس کے بعد اس کی ذاکری ختم ہی ہوجاتی۔ مگر یہ ان کی سابق مقبولیت اور زبان زد خلق وسعت نظر اور تبحر کا اثر ہے کہ اب بھی ان کی ذاکری مقبول ہے بالخصوص علماء اور افاضل کے طبقہ میں جس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مدرسۂ بزرگ آخوند کی مجلس میں جو شب کو ہوتی ہے کئی سو مجتہدین

اورقریب الاجتہاد علماء زیر منبر ہوتے ہیں اوران کے بیان کو گوش برآواز ہو کر سنتے ہیں۔

عام طور پر تاریخ میں یہاں ان کی وسعت نظر مسلم ہے کہا جاتا ہے کہ سرکار آقا سید ابوالحسن اصفہانی وغیرہ اکابرین مجتہدین کے پاس جو سوالات تاریخ سے متعلق آجاتے ہیں وہ انھیں بغرض جواب مرزا ہادی کے پاس بھیج دیتے ہیں۔

موصوف کے بیان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہت سی باتیں ایسی سننے میں آتی ہیں جو لوگوں کو معلوم نہیں ہیں۔ یہاں اس کا بھی خیال نہیں کیا جاتا کہ یہ چیز اس واقعہ کے خلاف ہے جو عام مسلمات میں داخل ہے۔ نہ وہ اس کے بیان کرنے سے کسی اندیشہ کی بنا پر جھجھکتے ہیں اور نہ لوگوں کو اسے سن کر وحشت ہوتی ہے بلکہ وہ ان کی وسعت نظر کی داد دیتے ہوئے اٹھتے ہیں۔

جو لوگ خود مذاق مطالعہ نہیں رکھتے وہ تو ان کی ہر بات کو آمنا وصدقنا کے طور پر قبول ہی کرتے ہیں وہ ان کے معلومات کی فراوانی پر عش عش کرتے ہیں کیونکہ انداز بیان بھی اس نوعیت کا ہے جس میں وہ منفرد ہیں کہ آٹھ محرم کی مجلس ہے اور اس میں انھیں حضرت ابوالفضل العباسؑ کا حال بیان کرنا ہے۔ تو اب وہ شروع سے علم کی تاریخ بیان کریں گے کہ جنگ میں اس کا استعمال کب سے شروع ہوا۔ اس کی شکلیں ہر دور میں کیا رہیں۔ عرب میں کتنی قسم کے علم تھے۔ کون ''رایت'' کہلاتا تھا اور کون لواء۔ قبل اسلام کے خاص خاص علمدار کون ہوئے اور انھوں نے کس طرح علمداری کی۔ اسلامی مجاہدات میں رسولؐ کے علمدار کون تھے۔ کن کن کو لواء ملے اور کس کس کو رایت ملنے کا شرف عطا ہوا۔ اور اس کے بعد وہ سلسلہ کے ساتھ حضرت ابوالفضل العباسؑ کی علمداری کا حال بیان کرتے ہیں۔ ایک دن مدرسہ وسطی کی مجلس میں جب کہ میں شریک تھا انھوں نے فرس کی تاریخ بیان کی تھی اور عرب کے گھوڑوں کا حال بیان کیا تھا، اور پھر ذوالجناح کے ابتدائی حالات اور کربلا میں اس کے کارنامے پر اختتام۔

ہمارے یہاں برادر محترم خطیب اکبر مولانا سید اولاد حسین عرف للن صاحب مرحوم کے یہاں کبھی کبھی کچھ وہ رنگ آجاتا تھا جس پر وہ یہاں منفرد مانے جاتے تھے اور واقعاً تھے۔

آقا مرزا ہادی کا ہر مجلس میں اور ہر موضوع میں یہی رنگ تھا۔ بے شک جنھوں نے خود مطالعہ میں کچھ جان کھپائی ہے اور عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزاری ہے انھیں اس ذیل میں بعض وقت ایک طرح کی پریشانی پیدا ہوتی ہے کہ آخر یہ سب کہاں ہے جو آج تک ہماری نظر سے نہیں گذرا مگر ان کی وسعت اطلاع یہاں اس طرح عوام میں بلکہ خواص کے طبقہ میں مسلمات میں داخل ہے کہ ایسے انسان کو بھی بالآخر اپنے ہی قصور علم کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ کہ یہ چیز میری نظر سے کبھی نہیں گذری اور اس کا مادہ تلاش سے بھی دستیاب نہیں ہوا۔

مثلاً ۳ محرم کی مدرسۂ بزرگ کی مجلس میں حسب ذیل باتیں سننے میں آئیں۔

۱۔ شریح قاضی کی مجلس قضا میں ایک مجرم عورت کو لائے جس پر حد شرعی جاری کرنا تھی مگر اس کا نام زینب تھا۔ شریح کانپنے لگا اور کہا میں ایسی عورت پر حد جاری نہیں کرسکتا جس کا نام زینب ہو۔

۲۔ وہب کی شہادت کے بعد زوجۂ وہب لاش پر آئیں اور سلائی خون وہب میں آلودہ کر کے اپنی دونوں آنکھوں میں پھیر لی۔

۳۔ شب عاشور حضرت سید الشہداؑ نے دیکھا کہ بی بیاں خیمہ جناب عباسؑ کو گھیرے ہوئے گریہ وبکا کر رہی ہیں۔ حضرت قریب گئے اور شقوق در سے دیکھا تو یہ نظر آیا کہ جوانان بنی ہاشم گلے مل رہے ہیں اور ایک دوسرے سے رخصت ہو رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت نے درگارہ الٰہی میں ہاتھ اٹھائے اور کہا یارب انت المستعان یارب انت المستعان۔

ماتمی دستے

عاشور کے دن ہر محلہ سے ماتمی جلوس برآمد ہوتے ہیں نجف اشرف چار بڑے محلوں میں تقسیم ہے۔ محلہ براق، محلہ مشراق، محلہ خویش اور محلہ عمارہ۔ یہاں ہمارے یہاں کی طرح

سے دس دس بیس آدمیوں کی انجمنیں نہیں ہیں جو ماتم کرتی ہوئی نکلیں بلکہ ہر محلہ کا ایک عظیم الشان جلوس ہوتا ہے اور سینہ زنی کے وقت ہزار بارہ سو ہاتھ ایک ساتھ سینہ پر پڑتے ہیں تو عجیب عالم ہوتا ہے۔ اطراف وجوانب کے جو دستے آتے ہیں وہ ان کے علاوہ ہیں اور ان کی بھی یہی شان ہوتی ہے کہ ایک ایک دستہ کئی سو یا کئی ہزار آدمیوں پر مشتمل ہوتا ہے، ان سب میں خاص منظر جو اس کے پہلے کبھی نہیں دیکھا وہ ترکوں کے دستے کا تھا جو قمہ زنی کرتا ہے۔ یہ سفید کفن پہنے ہوئے ہاتھوں میں تلواریں لئے ہوئے خون میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور برابر تلواروں سے ماتم کرتے جاتے ہیں۔ ساتھ ساتھ تختے رہتے ہیں کہ جو گرے اس کو تختہ پر اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ کثرت سے وہ ہوتے ہیں جو خون بہنے سے نڈھال ہوکر گر جاتے ہیں اور لے جائے جاتے ہیں جنھیں دیکھ کر خیال تو یہ ہوتا ہے کہ یہ اب مہینوں میں اچھے ہوسکتے ہیں۔ مگر اسے کرامت ہی سمجھا جاسکتا ہے کہ جہاں تک معلوم ہوا ہے ادھر وہ حمام گئے اور نہائے اور بس ٹھیک ہوگئے کہ اب دوسرے وقت اسی دن وہ کسی مجلس میں سینہ زنی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں شب عاشور مدرسۂ بزرگ آخوند سے اور روز عاشور حسینیہ بوشہریان سے طلاب و افاضل کا دستہ نکلتا ہے اس کی خصوصیت سنجیدگی اور متانت اور خاموش کیفیت حزن وملال ہے۔ رات والے دستے میں آگے آگے سادات ہوتے ہیں اور ان کے پیچھے غیر سادات۔ ہر شخص کے ہاتھ میں ایک شمع ہوتی ہے۔ ایک شعر پورا مجمع دہراتا ہے۔

اهـــل بيـــتي ودّعـــوني

يوم عـــاشر يقتلـــوني

حرم میں پہنچ کر یہ مجمع سینہ زنی کرتا ہے اور اس کے بعد پھر یہ دستہ روانہ ہوکر حسینیہ بوشہریان میں آکر نوحہ خوانی اور ماتم کرتا ہے نصف شب کے بعد یہ مجمع منتشر ہوتا ہے۔

چھلم کی مخصوصی

مخصوصی اس دن کی زیارت کو کہتے ہیں جس میں کسی معصوم کی زیارت خاص طور پر روایات میں وارد ہوئی ہے چنانچہ ۲۰ رصفر کی روزِ اولین کی مخصوصی کربلائے معلیٰ کی بڑی اہمیت رکھتی ہے اس دن نجف اشرف تقریباً خالی ہوجاتا ہے اور سب کربلائے معلیٰ آجاتے ہیں۔ دوسرے اطراف عراق بلکہ دیگر ممالک کے بھی بہت سے لوگ اس مخصوصی میں شرکت کے لئے آتے ہیں۔

عاشور کے دن یہاں جو شبیہیں بنتی ہیں وہ ہم ہندوستانیوں کے مذاق سے مطابق نہیں ہوتیں۔ ان میں مظالم کو بڑے سخت انداز میں دکھایا جاتا ہے یہ صحرائی عربوں کے سخت دلوں کے متاثر کرنے کے لئے شاید مفید ہوں مگر ہندوستان والے جو مصائب کی شبیہوں میں عموماً اشارات سے جو متاثر ہوجاتے ہیں ان کے لئے تو یہ شبیہیں آنسو خشک کردینے کا باعث ہوتی ہیں مگر اربعین کے دن کی شبیہیں بہت موثر ہوتی ہیں چنانچہ آج کی شبیہوں میں حضرت امام زین العابدینؑ اور بشیر کی شبیہ خوب تیار کی گئی تھی۔ اور یہ موقع بہت حسرت ناک تھا۔

ایک ہندوستانیوں کا دستہ بھی نکلا جو اپنے طریقہ سے ماتم کررہا تھا۔ مگر حق یہ ہے کہ عرب وعجم وترک دونوں ہاتھوں کو سر کے گرد گھما کر جس قوت کے ساتھ سینہ پر مارتے ہیں اور اس سے جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ بات ہمارے یہاں کے ماتم میں نہیں ہوتی۔

اس سال اربعین میں جو مجمع تھا وہ خود یہاں کے لوگوں کے نزدیک بھی غیر معمولی تھا۔ کچھ لوگوں کو کہتے سنا گیا کہ ۱۵ریا ۲۰رسال کے بعد اتنا مجمع ہوا ہے تمام کوچہ و بازار اور بیرون شہر تک ہر راستہ اور سڑک اور میدان ہے اور صحن اقدس میں تل رکھنے کی جگہ معلوم نہیں ہوتی۔ یہاں یہ اربعین کا دن عزائے امام مظلومؑ کی آخری تاریخ ہے۔

محرم ۱۳۴۷ھ

دوشنبہ کو ۲۹رذی الحجہ تھی۔ ہلال محرم نمودار ہوگیا۔ دلوں پر رنج وملال چھا گیا اور چہروں پر پژمردگی وافسردگی۔

مجالس

عشرہ میں جن مجالس میں شرکت ہوتی رہی وہ حسب ذیل ہیں۔
۱۔مدرسہ وسطی آقائے آخوندؒ (۲)مدرسۂ قوام
۳۔مقبرہ سرکار میرزائے شیرازی (۴)مدرسہ قزوینی
۵۔مکان آقا سید محمد علی بحر العلوم طباطبائی (یہ صبح کی مجلسیں ہیں جن میں عشرہ بھر میں باری باری شرکت ہوئی اور ان سب کے بعد باالتزام۔(۶) حسینیہ بوشہریان میں۔(۷)مکان حجۃ الاسلام آقا سید محمد خلخاں (۸) مدرسۂ حاجی۔ یہ دونوں عصر کی مجلسیں ہیں۔

(۹) مدرسۂ بادکوبہ۔ یہ خود ہمارا مدرسہ ہے جس میں اب ہمارا قیام ہے۔

(۱۰)مدرسۂ بزرگ آخوند طاب ثراہ۔ یہ دونوں رات کی مجلسیں ہیں۔

ان سب میں تین مجلسوں کو تمام شہر میں امتیاز خاص حاصل ہے۔
(۱)مکان آقا سید محمد علی بحر العلوم کی مجلس۔
(۲)حسینیہ بوشہریان۔(۳)مدرسہ بزرگ۔

آخری دو مجلسوں کا ذکر سال گذشتہ کے روزنامچہ میں بھی ہو چکا ہے۔آقا سید حسین بوشہری کے یہاں کی مجلس بڑی مقبول اور باعتبار بکا بہت پراثر ہوتی ہے۔ بڑے بڑے واعظین وروضہ خواں اس میں بالائے منبر جانا اپنا فخر سمجھتے ہیں ۔ یہاں ذاکری ہمارے لکھنؤ کے قدیم طور پر ہوتی ہے کہ پانچ سات ذاکر وواعظ یکے بعد دیگرے پڑھتے ہیں اور زیادہ تر باہمی مناسبت سے یعنی بقیہ نکال کر۔ ہاں ذاکرین میں یہاں کبھی کبھی ترتیب ساقط ہوجاتی ہے یعنی بڑا ذاکر آ کر کبھی پہلے پڑھ جاتا ہے اور چھوٹا ذاکر اس کے بعد آجاتا ہے اسے یہاں بر بنائے خلوص برا نہیں سمجھا جاتا۔

۶ رمحرم کی مجلس بے نظیر ہوئی۔ چار گھنٹہ مسلسل گریہ وبکا کا سلسلہ جاری رہا یہاں شدت گرمی سے غش آنے کا منظر بھی دیکھا جو ہمارے یہاں ہندوستان میں قدیم طرز ذاکری کی مجالس میں ہوتا تھا۔اب تو یہ تقریباً نایاب ہے۔

آل بحر العلوم کی مجلس میں اب کی پہلی بار شریک ہوئے اور وہ بھی ۹ رمحرم کو ان کے مکان کا دالان اور نیز صحن بہت وسیع ہے اور کوٹھے پر اور نیچے سب جگہ فرش تھا پھر بھی تل رکھنے کی جگہ نہ تھی وہ سخت کشمکش کہ العظمۃ للہ۔

ذاکری یہاں عربی زبان میں ہوتی ہے مگر ذاکری کا عنوان نیا پہلے ایک ذاکر نے ذرا تفصیل سے روضہ خوانی کی پھر مکان کے مختلف گوشوں میں چار پانچ روضہ خوان کھڑے ہو گئے اور پڑھنا شروع کر دیا ان کے بعد آخر میں شیخ محمد علی احتشام نے ذاکری کی اور باعتبار بکا حسینیہ بوشہریان سے بھی یہ مجلس بڑی معلوم ہوئی۔عرب اور انھیں شدت گریہ سے غش آتا، توقع کے خلاف چیز تھی اور یہاں ایک دو کو نہیں بلکہ متعدد عربوں کو غش آ گیا تھا۔

ذاکرین

اس مرتبہ جن ذاکرین کو سننے کا اتفاق ہوا وہ حسب ذیل ہیں۔ان میں سے چند وہ ہیں جنھیں سال گذشتہ بھی سنا تھا۔ باقی سب نئے ہیں۔ (۱) شیخ عبدالعلی زیادہ تر عربی میں پڑھتے ہیں۔(۲) سید صادق (۳) آقا شیخ حسن عراقی یہ دونوں فارسی میں پڑھتے ہیں۔(۴) آقا علی اصغر ترمذی (۵) آقا سید محمد حسین شوستری (۶) سید محسن قمی (۷) مرزا ابراہیم شیرازی یہ سب ایرانی حضرات ہیں فارسی میں پڑھتے ہیں۔(۸) آقا سید شاہ روضہ خان یہ ورع ودیانت میں مشہور ہیں حرم میں حدیث کساء روزانہ پڑھتے ہیں۔(۹) شیخ محمد علی جسام (ساکن جعارہ) عرب خطباء میں سید صالح علی کے بعد یہ بڑھ رہے ہیں۔تقریر بہت موثر ہوتی ہے۔آقا سید محمد علی بحر العلوم کے یہاں پورا عشرہ انھوں نے پڑھا مگر ہمیں صرف ۹ رمحرم کو شرکت کی سعادت حاصل ہوئی جس کا تذکرہ پہلے آ چکا ہے۔

(۱۰) آقا شیخ محمد علی خراسانی۔ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یہ بزرگ بلاشبہ معلمین میں سے ہیں۔ان کا بیان عملی حیثیت سے بڑی افادیت کا حامل ہے۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حق

ادا کرتے رہتے ہیں۔

(۱۱) آقا مرزا ہادی خراسانی ان کا ذکر بھی پہلے ہوا ہے مگر ان کی وسعت نظر کا جو اثر دل پر مرعوبیت کی حد تک تھا اس میں بڑی کمی ہوگئی جب ۷ رمحرم کو مدرسہ وسطی کی مجلس میں کچھ اشعار پڑھتے ہوئے جناب علامۃ الادباء مفتی سید محمد عباس شوستری اعلی اللہ مقامہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ بحر العلوم کے ارشد تلامذہ تھے اور عماد الاسلام کے مصنف ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ کتابی بات تو تھی نہیں کہ ہم ان کے تتبع وتلاش سے مرعوبیت کی بنا پر اس سے ناواقفیت کو اپنی کوتاہی معلومات پر محمول کرلیں۔ یہ تو ہمارے لئے ذاتی علم کی بات تھی۔ اس لئے مغرب کے وقت بازار میں موصوف سے ملاقات ہوئی تو میں نے انھیں مطلع کیا کہ جناب مفتی صاحب نے عراق کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ اور بحر العلوم کے دور کا انھوں نے ادراک بھی نہیں کیا۔ ان کی وفات ۱۳۰۶ھ میں ہوئی جبکہ بحر العلوم کو تقریباً ایک صدی کا زمانہ گذر چکا تھا۔ وہ تو سید العلماء آقا سید حسین کے شاگرد تھے جو مجدد ملت جعفریہ آقا سید دلدار علی کے شاگرد تھے۔ وہ بحر العلوم کے تلامذہ میں تھے اور عماد الاسلام انھیں آقا سید دلدار علی کی تصنیف ہے۔ موصوف نے اس سب کو بڑی توجہ سے سنا اور افسوس کیا کہ مجھ کو کبھی ایسا اشتباہ نہیں ہوا تھا یہ قابل تاسف غلطی ہے جس پر آپ نے توجہ دلائی آئندہ سے خیال رکھوں گا۔

اس کے بعد میں نے موصوف سے مسجد ہندی کے اصل بانی کا نام پوچھا انھوں نے فرمایا کہ وہ مرزا جواد ہندی تھے ان کی اولاد اب بھی نجف میں موجود ہے جن میں سے ایک مرزا عبدالحسین تھے جن کا انتقال ہوگیا۔

اس کو میں نے سن لیا اور یادداشت میں قلم بند بھی کررہا ہوں مگر سچی بات یہ ہے کہ اب پورا وثوق اس کے متعلق باقی نہیں رہا ہے۔ کیونکہ بعض وسیع النظر حضرات کی ایک ادا یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ کسی بات کو کہنا کہ ہمیں معلوم نہیں اپنی وسعت نظر کے خلاف سمجھتے ہیں۔ حالانکہ کتنی ہی وسعت نظر ہو لیکن پھر بھی ہمارے مجہولات کا دائرہ تو ہمارے معلومات سے زیادہ ہی ہے۔ لہٰذا کسی بات پر لاعلمی کے اظہار میں حرج ہی کیا ہے۔

روز عاشور ماتمی دستے

صحن اقدس حرم مرتضوی میں حسب معمول ماتمی دستے بڑے بڑے مجمعوں کے ساتھ آتے اور سینہ زنی کرتے رہے۔ اب کی قمہ زن ترکوں کا دستہ عجیب شان رکھتا تھا۔ سال گذشتہ پانچ سو تھے اور اب کی ان کی تعداد آٹھ سو تک تھی۔

خدام کا دستہ بھی بہت با اثر تھا۔ یہ لوگ ماتم کرتے ہوئے روضہ کے اندر چلے گئے اور سر پیٹتے ہوئے ضریح مقدس کے گرد چند دقیقہ تک طواف کرتے رہے پھر سینہ زنی شروع کی اور بہت زور سے ماتم کیا بلاشبہہ بڑا ہی غم انگیز منظر تھا۔

اربعین کی مخصوصی

مثل سال گذشتہ اس سال بھی بحمداللہ یہ مخصوصی ہم نے کربلائے معلیٰ میں کی یہاں تو مراسم عزا عشرہ کے صرف روز اربعین میں ادا کئے جاتے ہیں مگر کربلائے معلیٰ میں ہندوستانی چونکہ کافی تعداد میں رہتے ہیں اس لئے ان کے یہاں اپنے یہاں کے دستور کے مطابق چہلم میں پورے پورے عشرے مجالس کے ہوئے اور میں چونکہ اس مرتبہ ۱۵ رصفر کو کربلا پہونچ گیا تھا اس لئے ہندوستانی مجلسوں میں بھی کافی شرکت کا موقع ملا جن میں ایک مجلس صبح کو الہ آباد کے اعظم حسین خاں صاحب کے یہاں ہوتی ہے جس میں ۱۶ رصفر کو مجلس میں مولوی رضی الدین صاحب جونپور مرحوم کے صاحبزادے مولوی محمد حسین صاحب کا بیان ہوا۔ دوسرے دن ہمارے لکھنؤ کے جناب سید ہادی صاحب اعلی اللہ مقامہ کے صاحبزادے مولانا سید حسن صاحب نے ذاکری کی جس کے بعد امام رضا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تابوت بھی نکالا گیا۔ اور ماتم ہوا۔

۲۔ سہ پہر کو آقا سید نوری خادم کے مکان میں پنجابی زوار کی مجلس جس میں پہلے پنجابی میں ذاکری ہوئی جس کے سننے کا ہمیں پہلی مرتبہ اتفاق ہوا۔ پھر مولوی محمد حسین صاحب جونپوری کا بیان۔

۱۸/صفر کو اعظم حسین خاں صاحب کی مجلس میں مولوی سید سلطان حسین صاحب کا بیان ہوا جو ضلع میرٹھ کے رہنے والے ہمارے شاگرد ہیں۔ اس کے بعد تاج محل کے سامنے ایک مکان میں مجلس ہوئی جس کے بانی اور ذاکر ہی مولوی محمد حسین صاحب تھے۔

۱۹/صفر کو اعظم حسین صاحب کے یہاں پھر یہی مولوی محمد حسین صاحب پڑھے۔ اس کے بعد سرائے ناظم صاحب مرحوم کی مجلس میں شرکت ہوئی جہاں محمد رضا خاں صاحب مہتمم سرائے مذکور مجلسیں کرتے ہیں۔ یہاں ملا محمد باقر صاحب نے تذکرہ مصائب فرمایا۔

روز اربعین مثل سابق اطراف وجوانب کے ماتمی تھے۔ حرم اقدس میں آتے رہے۔ ایک ہندی دستہ بھی نکلا۔ اب کی خاص چیز یہ تھی کہ ۲۱/صفر کو اہل نجف کا دستہ آیا جس میں اتنی جمعیت تھی کہ ایک گھنٹہ میں دروازہ شہر سے صحن اقدس تک پہونچ سکے جہاں بڑے جوش وخروش سے سینہ زنی کی۔ اس کے بعد یہ دستہ روضہ حضرت ابوالفضل العباسؑ کی طرف روانہ ہوا۔ ہم ایک دوسرے مختصر راستے سے حرم حضرت ابوالفضل العباسؑ میں جاکر ایک مناسب جگہ کھڑے ہو گئے تھے ورنہ داخلہ ہی ممکن نہ تھا۔

یہاں خاص صورت جو پیدا ہوئی وہ یہ کہ رات زیادہ آنے کی وجہ سے روضہ کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ صرف صحن کھلا ہوا تھا۔ مجمع اتنا تھا کہ تمام صحن کے اطراف مملو ہو گئے اور جوش کے ساتھ ماتم شروع ہوا کلید دار سے کہا گیا کہ وہ دروازہ کھول دیں مگر انھوں نے انکار کیا۔ ماتمیوں نے کہا کہ اچھا تم دروازہ نہ کھولو۔ ہم خود کھلوا لیں گے۔ اب اس کے بعد منظر مشاہدہ سے متعلق ہے وہ تو یہ ہے کہ مجمع نے جوش کے ساتھ ماتم شروع کیا اور ایک دفعہ حرم کے سب دروازے کھل گئے اور ماتمیوں میں جوش کی انتہائی شدت پیدا ہوگئی اور شدید ہوسہ ہونے لگا کہ کئی آدمیوں کو غش آ گیا۔ منبر پر ایک شخص نے فی البدیہہ اشعار پڑھنا شروع کئے آخری مصرع یہ تھا **الزّوا المعافك الباب**۔

اس ہنگامی صورتحال سے حاضرین کا تاثر یہی تھا کہ یہ دروازوں کا کھلنا بطور معجزہ تھا چنانچہ ہم پر بھی ایک خاص اثر ہوا اور اسی تاثر کے عالم میں رواق میں کھڑے ہو کر بارگاہ الٰہی میں دعا مانگی جو انشاء اللہ مستجاب ہے۔ بعض لوگوں نے بعد میں کہا کلید دار نے فوراً خود دروازوں کو کھلوا دیا۔ واللہ اعلم تحقیقۃ الحال۔

محرم ۱۳۴۸ھ مجالس

نجف اشرف میں جن مجالس میں اس عشرہ میں شرکت کا موقع ملا وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مدرسہ وسطیٰ ۲۔ مقبرۂ سرکار میرزا اعلیٰ اللہ مقامہ ۳۔ مدرسہ قزوینی ۴۔ مکان حاجی عبدالمحمد شوستری تاجر ۵۔ مکان مولوی بختاور علی صاحب ۶۔ مکان آقا مجلسی اصفہانی ۷۔ کاشانۂ آقا سید محمد علی بحرالعلوم ۸۔ حسینیہ بوشہریان ۹۔ مکان آل کاشف الغطاء یہ صبح سے ظہر تک کی مجلسیں ہوئیں۔

۱۰۔ مدرسۂ حاجی ۱۱۔ مدرسۂ صدر ۱۲۔ مکان آقا سید محمد خلخالی۔ یہ تینوں عصر کی مجلسیں ہیں۔

۱۳۔ مدرسۂ بادکوبہ ۱۴۔ مکان حاج آقا شیخ عبداللہ مامغانی ۱۵۔ مکان آقا سید عبدالغفار مازندرانی ۱۶۔ حسینیہ شوستری ۱۷۔ مسجد شیخ رحمۃ اللہ۔ ۱۸۔ مدرسۂ بزرگ آخوند رحمہ اللہ۔

یہ رات کی مجلسیں ہیں۔ ان سب میں امتیازی حیثیت مکان آقا سید محمد علی بحرالعلوم حسینیہ بوشہریان اور مدرسۂ بزرگ کی مجالس کو حاصل ہے۔

ذاکرین

اس مرتبہ عشرۂ محرم میں حسب ذیل ذاکرین کے سننے کا موقع ملا۔ ۱۔ آقا شیخ محسن عراقی۔ ۲۔ آقا شیخ عبدعلی ۳۔ آقا سید حیدر حلی ۴۔ آقا سید محمد حسین شوستری ۵۔ آقا میرزا ابراہیمؒ شیرازی ۶۔ شیخ محمد علی یعقوب ساکن جعارہ۔ ۷۔ آقا شیخ محمد علی خراسان ۸۔ آقا مراز ہادی طہرانی۔

اور بعض نئے ذاکرین جن کے نام معلوم نہیں ہو سکے مگر انھیں کوئی خاص اہمیت نہیں۔ مذکورہ بالا واعظین وذاکرین میں

نمبر ایک کے ذاکرین وہی چار ہیں۔ دوعرب ۔ سید حیدر حلی ۔ اپنے کمال وارتقا کی منزلیں طے کر چکے ہیں ان کا بیان آل کاشف الغطاء کے یہاں ہوتا ہے اور شیخ محمد علی یعقوب یہ ترقی کررہے ہیں۔ ان کا بیان آقا سید محمد علی آل بحرالعلوم کے یہاں ہوتا ہے۔ اور دوعجم آقا شیخ محمد علی اور آقا مرزا ہادی۔

آقا مرزا ہادی طہرانی سے اس مرتبہ جو افادات سننے میں آئے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ حارث پسران جناب مسلم کا قاتل جناب ہانی بن عروہ کا بھائی تھا۔

۲۔ شریح قاضی کی عمر ایک سو پینسٹھ سال تک پہونچی تھی۔

۳۔ جناب سلمان فارسی کے دو فرزند تھے محمد و عبداللہ۔ محمد کا انتقال ان کی زندگی میں ہوا تھا۔ عبداللہ بعد میں باقی رہے اور انہی کے نام ان کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ سلمان کی نسل عبداللہ کے واسطہ سے پانچویں صدی ہجری تک باقی تھے۔ رکن الدولہ کے زمانہ میں شہر سمرقند کے اندر اولاد سلمان میں سے بہت سے اہل علم موجود تھے۔ بعد میں یہ نسل منقرض ہوگئی۔ نیز سلمان کی تین لڑکیاں تھیں جن میں سے ایک مصر میں اور ایک شیراز میں بیاہی ہوئی تھیں۔

۲رمحرم کو حسینیہ بوشہریان کی مجلس میں آقا شیخ محمد علی خراسانی اور آقا میرزا ہادی طہرانی کا اجتماع ہوگیا تھا۔ دونوں ہم عمر اور ہم عصر۔ یہ صورت بہت پرلطف تھی۔ مجلس بھی خوب ہوئی مگر یہاں ایسے موقعوں پر باہم ایک دوسرے پر چوٹ یا کسی باہمی کشاکش یا فتح وشکست اور عزت وذلت کا تصور نہیں کیا جاتا اور نہ کیا جانا چاہئے۔ مگر ہمارے ہندوستان میں ایسے موقعوں پر ایسی بدنما صورتیں اکثر پیدا ہوجایا کرتی ہیں۔

ایک علمی گفتگو

۲رمحرم شب کو ہمارے مدرسۂ بادکوبہ کی مجلس میں آقا شیخ محمد تبریزی نے جو افاضل میں سے ہیں قبل مجلس باہمی گفتگو میں یہ اعتراض پیش کیا کہ حضرت امام حسینؑ کا ارشاد شٓاء اللہ ان یرانی قتیلا ۔ کو اگر تسلیم کیا جائے تو اشقیائے کوفہ وشام کا فعل (معاذ اللہ) محبوب حضرت الٰہی ماننا پڑے گا۔ میں نے کہا کہ واقعۂ شہادت میں ایک فعل وہ ہے جو اعدا کی طرف منسوب ہے یعنی قتل حضرت کے لئے جمع ہونا اور اسباب شہادت فراہم کرنا، یہ مبغوض باری تعالیٰ تھا اور ایک فعل ہے جو حضرت کی طرف نسبت رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ جتنا بھی وہ لوگ اسبابِ قتل مہیا کریں ان کا حضرت اسباب عادیہ سے بالاتر اپنی قدرتِ امامت کے ذریعہ سے مقابلہ نہ فرمائیں اور بقدر تکلیف شرعی جہاد کے فریضہ کو انجام دے کر اپنے کو سپرد مظالم فرمادیں۔ یہ محبوب حضرت احدیت تھا، لہٰذا بغض وحب کا متعلق مختلف ہے۔ آقا شیخ احمد مشکینی نے دخل دیتے ہوئے اس پر یہ ایراد کیا کہ جب نفسِ وقوع شہادت مطلوب ہوگیا تو اعدا کا فعل اس کا مقدمہ قرار پائے گا۔ اور مقدمہ واجب، واجب ہوتا ہے لہٰذا ذوالمقدمہ کے مطلوب ہونے سے یہ مقدمہ بھی مطلوب ہونا چاہئے۔ میں نے کہا کہ حضرت کا اپنے کو شہادت کے لئے پیش کردینا خود مترتب تھا اس پر کہ وہ لوگ شہید کرنے کے لئے آئیں لہٰذا حضرت سے یہ فعل مطلوب تھا اسی صورت میں کہ جب ان سے وہ فعل مبغوض سرزد ہو۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ان کا فعل مقدمہ وجوب تھا جس کے بعد ذوالمقدمہ میں مطلوبیت پیدا ہوتی ہے نہ کہ مقدمہ وجود، تاکہ اس میں مطلوبیت سرایت کرجائے۔ یہ جواب قاطع تھا جس کے بعد کوئی گنجائش کلام نہ تھی۔

مبکی خطابت

ایک ہمارے ہم درس بڑے مقدس سیرت اور مقدس صورت آقا سید محمد حسین شہرستانی منبر پر حسینیہ بوشہریان میں اپنے تقدس کے انداز میں ذاکری کرتے ہیں جو بڑی موثر ہوتی ہے۔

۶رمحرم۔ روز جمعہ کی مجلس میں انھوں نے کہا:

''آج جمعہ ہے شب کو حضرت فاطمہ زہراؑ کربلا میں زیارت کے لئے ضرور آئی ہوں گی۔ آپ نے وادی اسلام میں دیکھا ہوگا کہ عورتیں اپنے عزیزوں کی قبروں پر گریہ کے لئے آتی ہیں۔ اب ان میں جب کسی عورت کے جوان فرزند کی قبر ہوتی

ہے تو اس کا کیا عالم ہوتا ہے۔ پھر حضرت زہراؑ سلام اللہ علیہا کا کربلا میں اپنے مظلوم وغریب فرزند کی قبر پر کیا حال ہوگا۔

ایک خصوصیت خاص یہ ہے کہ آپ زیارت روضۂ حسینی کو جاتے ہیں تو آپ کی نظر ضریح مبارک اور درودیوار پر پڑتی ہے اور پھر کیا اثر ہوتا ہے اور فاطمہ زہراؑ کو تو خدا نے چشم بصیرت عطا فرمائی ہے ان کی نظر خاص جسد بے سر سید الشہداؑ پر پڑتی ہے اور پائین پا علی اکبرؑ کا جسم پارہ پارہ اور پہلو میں علی اصغرؑ کا لاشہ آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے۔

اخبار متواترہ میں وارد ہے کہ امیر المومنینؑ ہر محتضر کے پاس عالم احتضار میں تشریف لاتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ آپ اپنے فرزند حسینؑ کی حالت احتضار میں بھی موجود تھے یا نہیں مجلس کا عالم یہ تھا کہ زن ومرد سر وسینہ پیٹ رہے تھے۔

عشرہ

عاشور کا دن، بادل پر صدمہ وملال کا ہجوم اور ہر کوچہ وبازار سے واحسین واحسین کی آواز۔ اس مرتبہ قمہ زنوں کے تین دستے یکے بعد دیگرے آئے جن میں چار سو آدمیوں سے کم جمعیت نہ ہوگی۔ جوش ہر سال سے زیادہ تھا۔ اکثر اشخاص سر سے پاؤں تک خون میں تر تھے اور جب تک کہ گر نہ جاتے تھے یا تلوار ہاتھ سے چھین نہ لی جاتی تھی وہ ماتم سے باز نہ آتے تھے۔ وہ موقع کہ جب یہ خون میں آغشتہ گروہ صحن اقدس میں ماتم کررہا تھا دھوپ اتنی سخت تھی کہ بے اختیار ہم نے عبا سر پر ڈال لی لیکن فوراً خیال ہوا کہ تف ہے اس راحت نفس پر۔ آخر یہ بھی تو انسان ہیں جوان زخموں کی حالت میں اس آفتاب کی گرمی کو برداشت کررہے ہیں۔ یہ سوچ کر فوراً سر سے عبا نیچے اتار لی۔ صحن کی زمین پر جابجا خون کے تھالے بندھ گئے۔ اس دفعہ یہ تازہ بنا تھی کہ آقا شیخ محمد حسین کاشف الغطاء کے یہاں سے اہل علم کا دستہ نکلے گا۔ چنانچہ قبل ظہر اہل علم کا دستہ جس میں کئی سو افراد شریک تھے برآمد ہوا جس میں آگے آگے آقا سید محمد علی بحر العلوم، آقا شیخ جواد جواہری، علامہ شیخ محمد حسین کاشف الغطاء علامہ شیخ ہادی آل کاشف الغطاء، علامہ شیخ مرتضیٰ آل کاشف الغطاء اور آقا شیخ محمد رضا آل یٰسین وغیرہ موجود تھے۔ بہت پر اثر دستہ تھا۔ بازار بزرگ سے ہوتے ہوئے حرم اقدس میں داخل ہوئے اور ضریح اطہر کے گرد ایک گھنٹہ تک زوروشور کا ماتم ہوا، جس کی نظیر اس سے پہلے دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ تمام رواق وحرم میں گریہ وزاری کا شور برپا تھا۔

۲۵/محرم

وفات امام زین العابدینؑ کی وجہ سے بازار بند رہے اور تمام شہر میں آثار حزن والم نمودار۔ صبح کو مدرسہ وسطیٰ میں مجلس ہوئی، جس میں آقا شیخ محمد علی خراسانی کا بیان ہوا۔

۲۰/صفر

چہلم کی مخصوصی مثل دستور قدیم کربلائے معلیٰ میں ہوئی۔ وہی عظیم اجتماع، وہی جوش وخروش اور وہی ہنگامہ ماتم۔ بس اس مرتبہ یہ ایک کمی رہی کہ اہل نجف کا دستہ کاظمینیوں سے کچھ نزاع اور پھر تصادم کا اندیشہ پیدا ہونے کی وجہ سے نہیں نکلا، جسے نجفیوں کی قابل قدر امن پسندی کا نتیجہ سمجھا گیا۔

[ماخوذ از پیام اسلام لکھنؤ ۸ جولائی ۱۹۵۹ء/محرم ۷۹ ۱۳ھ ص ۳۴ تا ۴۱]

❁❁❁

حسینؑ

آنجہانی برج ناتھ پرشاد صاحب مخمور لکھنوی

کونین کی قسمت کے ستارے ہیں حسینؑ
ہر مذہب وملت کے سہارے ہیں حسینؑ
غم جذبۂ گریہ سے سنور جاتا ہے
ہر اشک یہ کہتا ہے ہمارے ہیں حسینؑ

❁❁❁

گلے کے خون سے تازہ ہر اک کلی کی ہے
قدم قدم پہ زمانے کی رہبری کی ہے
بتا رہے ہیں برستے ہوئے یہ اشک حسینؑ
جو کم نہ ہوگی کبھی ایسی روشنی کی ہے